جلد۲ شمارہ ا
جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء

چیلنج

ایڈیٹر: عذرا طلعت سعید

زراعت، گلوبلائزیشن کی زد میں

تیسری دنیا کے ممالک کے لیے ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے زراعتی معاہدے میں دی گئی چھوٹ کی مدت دسمبر ۲۰۰۴ میں ختم ہوجائے گی اور یکم جنوری ۲۰۰۵ سے ڈبلیوٹی او کا یہ معاہدہ پہلی اور تیسری دنیا کے لیے یکساں طور سے لاگو ہوجائے گا۔ حکومت کے اب تک کیے گئے اقدامات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ڈبلیوٹی او میں دی گئی چھوٹ کی مدت سے پوری طرح باخبر ہے۔ حکومت اس معاہدے میں دیے گئے ہدایات کو عین وقت پر پورا کرکے اپنے آپ کو سرمایہ دارانہ نظام کا فرماں بردار ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے، اس کی خاطر حکومت اپنے ہر اثاثے کو نیلام اور اپنی عوام کو گہری خندق میں پھینکنے کے لیے تیار ہے۔ پاکستان کی سرمایہ کاری پالیسی اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ ہم نے کھلی منڈی کی پالیسی اختیار کررکھی ہے اس لیے غیرملکی سرمایہ کار پاکستان میں اپنا سرمایہ لگانے پر قطعاً پریشان نہ ہوں، ان کی سہولت کے لیے ہر ممکن تدبیریں تلاش کرکے ان کو فوراً پائے تکمیل تک پہنچایا جارہا ہے۔ اگر کوئی امر رہ گیا ہے تو وہ پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ کا نفاذ ہے۔ یہ وہ آخری کڑی ہے جس کے تحت ہم اپنی زراعت کو خیرباد کہہ کر اس کی باگ ڈور مکمل طور پر غیرملکی زرعی کمپنیوں کے حوالے کردیں گے۔ جی-۷ ممالک نے اپنی زرعی کمپنیوں کی مفاد کی خاطر جس راؤنڈ کی ابتدا ۱۹۸۶ میں یوروگوئے میں کی تھی، وہ کم ازکم پاکستان میں کامیابی سے ہمکنار ہو جائیں گے۔ یہ اس ملک اور عوام کے لیے نئے سرے سے نوآبادیاتی نظام کا آغاز ہوگا۔

وہ کروڑوں انسان جو اس ملک کی بقاء اور آزادی کے ضامن ہیں ایک دفعہ پھر غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کردیے جائیں گے۔ برطانوی نوآبادیاتی نظام میں تو کم ازکم غیرملکی نظام سنبھالنے آئے تھے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس بار ''بہادری'' کا فریضہ، ہم نے خود سنبھالا ہے۔ اب ہمیں غیرملکی بادشاہت کی ضرورت نہیں، ہم خود ہی ظلم وتشدد کے لیے درکار تمام ہتھیاروں میں مکمل طور پر خودکفیل ہیں۔

ایک ایسے وقت میں جب ڈبلیوٹی او اپنے ایجنڈے کو پائے تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوچکا ہے، عالمی برادری پائیدارترقی پر بحث ومباحثہ کرنے کی تگ ودو میں مصروف ہے۔ اس سال اگست میں جوہانس برگ، جنوبی افریقہ میں عالمی کانفرنس برائے پائیدارترقی منعقد ہونے والی ہے۔ پائیدارترقی کے حصول کی خاطر اٹھنے والے تمام جذبات اور مثبت پالیسیوں کی تجاویز کو عالمی مالیاتی اور تجارتی اداروں، جی-۸ کے ممالک اور بین الاقوامی کمپنیوں نے روند ڈالا ہے۔ ان حالات میں پائیدارترقی کی حیثیت ایک کھوکھلے نعرے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

پائیدارترقی اور عوامی آزادی کا حصول اب عوام کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے سامنے ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جب عوام نے اس نوآبادیاتی نظام کے خلاف پرچم بلند کیا ہے۔ حال ہی میں عوام نے ارجنٹینا اور وینزولا میں حکومتوں کا خاتمہ کیا، روم میں ۳۰ لاکھ مزدوروں نے حکومتی پالیسیوں، بارسلونا میں ۵ لاکھ افراد نے یورپی یونین اور واشنگٹن میں ہزاروں افراد نے عالمی مالیاتی اداروں کے خلاف احتجاج کیا۔ یہ تمام واقعات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ عوام آج بھی اپنے حقوق کی جنگ لڑرہی ہے۔ اگر یہ لڑائیاں منظّم اور ایک آواز بن کر لڑی جائیں تو یہ نئے نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کا سبب بن سکتی ہیں اور ظلم وتشدد اور منافع کی بنیاد پر تعمیر اس نظام کا خاتمہ کرکے ایک پرامن اور پائیدارترقی کی بنیاد پر مبنی عوامی فلاح وبہبود کے اصولوں پر قائم نظام کا حصول ممکن ہے۔

فہرست مضامین

ایشیائی ترقیاتی بینک کا زرعی قرضہ 2
زرعی سرمایہ کاری پالیسی 5
نیم کے مفید اثرات اور استعمال 8
خالی وعدے...... خالی پیٹ 9
پائیدارترقی کی جانب منفی اقدامات! 11
بات تو سچ ہے مگر 16
رخ زمانہ 19

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے ایچ بی ایف (Heinrich Boll Foundation) کے تعاون سے شائع کیا ہے۔

سیکرٹریٹ: اے-113، بلاک 13- ڈی، گلشن اقبال، کراچی
فون/فیکس: 9267 497 21 92+ ای میل: roots@super.net.pk
فیلڈ یونٹ: پلاٹ نمبر 46 گلشن فیض-II، ٹنڈو محمد خان، فون 42373 224 92+

ایشیائی ترقیاتی بینک کے زرعی قرضے کے پس پردہ محرکات اور اثرات

سرتاج خان

ایشیائی ترقیاتی بینک (اے ڈی بی) نے ۱۳ دسمبر ۲۰۰۱ کو پاکستان کے زرعی شعبہ کی اصلاحات کیلئے ۳۵۰ ملین ڈالرز کے مالیت کے برابر قرضہ منظور کیا۔ قرضہ تین اقساط میں ادا کیا جائیگا جنکی مالیت بالترتیب ۱۲۵ ملین ڈالرز، ۱۰۰ ملین ڈالرز اور ۱۲۳ ملین ڈالرز ہوگی جبکہ ۲ ملین ڈالرز کی رقم تکنیکی امداد کی شکل میں دی جائے گی۔ امداد کا دورانیہ دسمبر ۲۰۰۱ سے پانچ سال کے عرصہ پر محیط ہوگا۔ قرضے کی منظوری کے موقع پر اے ڈی بی کے ایک اعلیٰ عہدے دار نے کہا کہ یہ اصلاحات زرعی پیداوار اور مارکیٹنگ پر حکومتی کنٹرول کو مرحلہ وار ختم کرنے میں مدد دے گی جس سے عہدہ برآں ہونے کے لیے نجی شعبہ بہتر طور پر تیار ہے۔

قرضہ کا ایک اہم مقصد پاکستان کے زرعی شعبہ میں نجی شعبہ کے کردار کو بڑھانا ہے[1]۔ قرضہ کی پہلی قسط کی ادائیگی کو اصلاحات کی پیشگی شرائط سے جوڑا گیا ہے یعنی جب تک بینک کے شرائط پورے نہ کیے جائیں؛ قرضہ کی پہلی قسط جاری نہیں کی جائیگی[2]۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کی ہر قسط سے پہلے حکومت کو کچھ اقدامات کرنے ہوں گے جو کہ قرضوں کی تاریخ میں انوکھے ہیں کیونکہ عام طور پر قرضہ ملنے کے بعد حکومتیں اصلاحات کے ایجنڈے پر عملدر آمد کی طرف بڑھتی ہیں، لیکن اے ڈی بی نے اس لحاظ سے سخت شرط رکھی ہے کہ پہلے حکومت کچھ اقدامات کرے، اس کے بعد قرضہ کی قسط ادا کی جائیگی۔ اے ڈی بی غالباً حکومتی سست روی یا پھر عوامی مزاحمت کے ممکنہ رد عمل کی وجہ سے کسی رخنہ اندازی کے امکان کو بالکل ہی ختم کرنا چاہتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ملک میں بیج، کھاد، کیڑے مار ادویات تیار کرنے والی کمپنیوں اور زرعی اجناس کی درآمد اور برآمد کا کاروبار کرنے والی بین الاقوامی کمپنیوں کیلئے تیزی سے راہ ہموار کرنے کی طرف ایک اہم قدم ہے۔

ایشیائی ترقیاتی بینک (اے ڈی بی) ۱۹۶۶ میں قائم ہوا۔ بینک کے اکثر ممبران کا تعلق ایشیاء اور بحرالکاہل کے خطے کے ممالک سے ہے۔ اس وقت بینک کے ۵۹ ممبران ہیں۔ بینک کا صدر دفتر فلپائن کے شہر منیلا میں واقع ہے۔ دیگر بینکوں کی طرح اے ڈی بی کے بھی حصہ دار (شیئر ہولڈرز) ہیں جن میں امریکہ (۹ء۱۵ فیصد) اور جاپان (۹ء۱۵ فیصد) دو بڑے حصہ دار ہیں۔ بینک کے بورڈ آف گورنرز میں ہر ممبر ملک کا ایک نمائندہ شامل ہوتا ہے۔ یہی بورڈ ۱۲ رکنی بورڈ آف ڈائریکٹرز کا انتخاب کرتا ہے۔ بینک کا سربراہ صدر کہلاتا ہے۔

بینک کے اغراض و مقاصد

- غربت میں کمی کرنا
- معاشی ترقی
- انسانی وسائل کی ترقی
- خواتین کی حیثیت بہتر بنانا
- ماحول کو بچانا

پچھلے چند سالوں سے عالمی سطح پر آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور ڈبلیو ٹی او کے ساتھ ساتھ اے ڈی بی کی پالیسیاں بھی انتہائی تنقید کی زد میں آئی ہیں۔ تنقید کرنے والوں میں ان اداروں کے اپنے لوگ تک شامل ہیں۔ سیاٹل کے بعد دنیا بھر میں عوامی مظاہروں نے ان اداروں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی پالیسیوں اور منصوبوں کو خوشنما ناموں سے اس طرح متعارف کروائے کہ وہ عوام دوست معلوم ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی بینک، آئی ایم ایف اور اے ڈی بی نے "غربت میں کمی" کو اپنا نعرہ بنایا ہے لیکن اس خوشنما نعرہ کے پس پردہ آزاد تجارت کی پالیسیوں کو آگے بڑھانا ہے۔

(www.adb.org)

حکومت نے قرضہ کی منظوری کے بعد متعلقہ اصلاحات پر فوری کاروائی کا فیصلہ کیا تاکہ قرضہ کی پہلی قسط جلد از جلد حاصل کی جا سکے۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق اے ڈی بی کی شرائط میں بیج پر سے سرکاری کنٹرول ختم کرنے اور نجی شعبہ کی حوصلہ افزائی کیلئے شعبہ خوراک کی بندش اور تمام بڑی فصلوں پر دی جانے والی اعانتوں کا خاتمہ شامل ہے۔ حکومت پہلے ہی ایشیاء کی سب سے بڑی سیڈ کارپوریشن، پنجاب سیڈ کارپوریشن کو ختم کرنے کے درپے ہے تاکہ بیج کا کاروبار کرنے والی بین الاقوامی کمپنیوں کیلئے منڈی پر قبضہ کی راہ ہموار کی جاسکے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ پنجاب سیڈ کارپوریشن کم داموں میں کسانوں کو بیج فراہم کرتی ہے۔ بین الاقوامی کمپنیوں اور پنجاب سیڈ کارپوریشن کے درمیان فی بوری قیمت میں کم از کم ۲۰۰۰ روپے کا فرق ہے۔ اس کارپوریشن کے خاتمے سے غریب اور چھوٹے کاشتکاروں سے لیکر درمیانے پیمانے کے کاشتکار زیادہ متاثر ہوں گے۔ اب یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ پنجاب سیڈ کارپوریشن نجی شعبے سے تعاون بڑھائے گا اور تحقیق شدہ بیج ان کے حوالے کریگا تاکہ نجی شعبہ منافع کما سکے۔

پاکستان اور ایشیائی ترقیاتی بینک کے درمیان معاہدے کے مطابق گندم پر دی جانے والی اعانت (سبسڈی) کا مرحلہ وار خاتمہ کرتے ہوئے ۲۰۰۴ء تک مکمل خاتمہ کر دیا جائے گا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہی مطالبہ عالمی زرعی معاہدے (اے او اے) کے تحت بھی کیا جا رہا ہے۔ حکومت اور اے ڈی بی، دونوں کا خیال ہے کہ اس طرح ۱۵ بلین روپے (۱۵ ارب روپے) کی بچت ہوگی۔ پاکستان اسٹوریج سروسز کارپوریشن (پاسکو) اب صرف اہم مقاصد مثلاً ہنگامی حالات کیلئے گندم محفوظ کریگا، باقی تمام زرعی اشیاء کو نجی شعبہ کیلئے چھوڑ دیا جائے گا۔ پاسکو کے زیر انتظام ذخیرے کے

بارے میں فیصلہ ہر سال مارچ اور اپریل میں کیا جائے گا۔ حکومت نے نئی پالیسی کے تحت گندم کی خریداری کم کردی ہے اور نجی شعبے کے لیے امداد کے طور پر ۴۵ بلین روپے کا قرضہ منظور کیا ہے تا کہ وہ گندم کی خریداری کر سکے، لیکن اس کا اثر یہ پڑا ہے کہ نجی شعبہ حکومتی نرخ سے ۱۵۵ روپے فی بوری کم ہے[۳]۔ اطلاعات کے مطابق محکمہ خوراک نے گندم کی خریداری کے کئی سرکاری مراکز بند کردیے ہیں[۴]۔ یہ تمام اقدامات ان پالیسیوں کا حصہ ہے جس کے تحت حکومت کی طرف سے ہر سال خریداری کم کرتے ہوئے نجی شعبے کو آگے لانا ہے۔ اے ڈی بی کے دباؤ کے تحت حکومت نے اس سال گنے کی امدادی قیمت کا فوری طور پر خاتمہ کیا ہے جبکہ گندم کی امدادی قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ پچھلے سال مجموعی طور پر کسانوں کو گندم کی قیمتوں میں کمی سے ۲۰ بلین روپے اور پانی کے آبیانہ اور کیڑے مار ادویات کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ سے ۱۲ بلین روپے کا نقصان ہوا ہے، اس طرح کسانوں کو مجموعی طور پر ۳۲ بلین روپے سالانہ کا خسارہ برداشت کرنا پڑا[۵]۔ پاکستان نے اے ڈی بی کو یقین دہانی کرائی ہے کہ ملک میں چینی کی درآمد پر کوئی پابندی نہیں ہوگی اور چینی کی صنعت کو حاصل حکومتی تحفظات کا خاتمہ کردیا جائے گا۔ بجلی، تیل، بینکوں اور ساہوکاروں سے لیے گئے قرضہ، ٹیکسوں کی بھرمار، کھاد اور بیج کے علاوہ کیڑے مار ادویات کی بڑھتی ہوئی قیمتیں کسانوں کے لیے مزید تباہی کا باعث ہیں۔ آزاد تجارت اور نقد آور فصلوں کی وجہ سے کسانوں کی غربت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

امدادی قیمت یا اعانت کے طریقہ کار کے مطابق حکومت کسانوں سے زرعی اجناس مہنگے داموں خریدتی ہے اور عوام کو نسبتاً سستے داموں فراہم کرتی ہے۔ اس طرح حکومت کسانوں کو ان زرعی اجناس کی کاشت کی طرف راغب کرتے ہیں جو عوام کے خوراک کا بنیادی حصہ ہوتی ہیں۔ اس طرح عوام تک سستے داموں اناج کی فراہمی کسی حد تک ممکن بن جاتی ہے۔ چھوٹ اور امدادی قیمتوں کے خاتمے سے عوام کو ۱۵ بلین روپے کا اضافی بوجھ برداشت کرنا ہوگا جبکہ دوسری طرف کسانوں کیلئے یہ آسان ہوجائے گا کہ وہ دیگر نقد آور فصلوں مثلاً کپاس کی طرف متوجہ ہوں جس سے پورے ملک میں تحفظ خوراک کا مسئلہ شدید تر ہوجائے گا جبکہ زیادہ رقبے کا نقد آور فصلوں کی طرف منتقلی بہت سے اہم ماحولیاتی مسائل کو بھی جنم دے گی۔

ایشیائی ترقیاتی بینک اور حکومت، دونوں اس بات پر بھی پوری طرح متفق ہیں کہ ملک میں جدید آزاد تجارت کی بنیاد پر اصلاحات کیے جائیں۔ ان کے خیال میں منڈی فعال بنانے سے چھوٹے کاشتکاروں کے حالات بہتر ہوں گے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ پاکستان میں ۹۳ فیصد چھوٹے کاشتکار ہیں۔ سبز انقلاب کے اثرات کے باوجود آج بھی ایسی فصلیں زیادہ اگائی جاتی ہیں جو ہمارے خوراک کا حصہ ہیں مثلاً گندم اور چاول اگانے کو ترجیح دی جاتی ہے اگرچہ نقد آور فصلوں کی طرف رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ مکئی اور چاول کی جگہ کپاس جیسی نقد آور فصلوں کی طرف راغب ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ گزشتہ سال ملتان کے علاقے میں کپاس کے زیر کاشت رقبے میں ۵۷ فیصد اضافہ ہوا، اس کا دوسرا مطلب خوراک کی غرض سے پیدا کی جانے والی زرعی اجناس کے زیر کاشت رقبہ میں ۵۷ فیصد کمی ہے۔ یہ تبدیلی صرف ملتان تک ہی محدود نہیں، پاکستان میں مجموعی طور پر زرعی اجناس کے رقبہ میں کمی اور کپاس کے زیر کاشت علاقہ میں ۵۶ ۵ء۷ فیصد اضافہ ہوا ہے[۶]۔ یہ ایک بہت ہی تشویش ناک صورتحال کی نشاندہی کرتی ہے۔ بینک کا موقف ہے کہ موجودہ پروگرام سے ''چھوٹے اور نظر انداز'' کیے گئے کسانوں کی پیداوار اور منافع میں بہتری پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ گندم کپاس، چاول، گنا کے علاوہ کھاد اور بیج کیلئے منڈی کو زیادہ فعال بنایا جاسکے۔ پروگرام کے مطابق نجی شعبے کے کردار کو بڑھانے کی خاطر ریاست کی طرف سے اشیاء اور سہولتوں کی فراہمی کو نجی شعبہ کو منتقلی ضروری ہے۔

قرضہ کا ایک اہم مقصد کھاد اور کیڑے مار ادویات کی منڈی کو فعال بنانا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سبز انقلاب کے بعد سے ان دونوں مصنوعات کے استعمال میں مسلسل اضافہ ہونے کی وجہ سے اس کاروبار سے وابستہ کمپنیوں کے منافع جات میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے مثلاً گزشتہ سال جب کسان کو بارشوں کی کمی کے باعث خشک سالی اور قحط کا سامنا تھا، جس کی وجہ سے وہ آج بھی قرضوں تلے دبے ہوئے ہیں، کھاد تیار کرنے والی ایک کمپنی اینگرو یوریا کا منافع میں ۲۹۵ فیصد اضافہ ہوا کیونکہ کمپنی نے اس دوران ایک ٹن یوریا کی قیمت میں ۸۰۰۔۱۰۰۰ روپے اضافہ کیا۔ کمپنی کے بقول اسکی وجہ حکومت کی طرف سے گیس کی قیمتوں میں اضافہ اور جنرل سیلز ٹیکس (جی ایس ٹی) کا نفاذ ہے[۷]۔ ڈی اے پی کی قیمت میں صرف جی ایس ٹی کی وجہ سے ۱۰۰ روپے فی بوری اضافہ ہوا ہے اس سے یہ بھی واضع ہوتا ہے کہ حکومت کی طرف سے گیس، بجلی، تیل کی قیمتوں میں اضافہ اور خام مال سمیت دیگر اشیاء پر جی ایس ٹی کے نفاذ کا خمیازہ بالا آخر کاشتکار کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ جی ایس ٹی سے حکومت آئی ایم ایف یا اے ڈی بی سے لیے ہوئے قرضہ واپس کرتی ہے۔ کمپنی کا منافع چیز کی قیمت میں اضافہ سے ہوتا ہے۔ کھاد کے زیادہ استعمال اور کمپنیوں کے بڑھتے ہوئے منافع جات کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ نئے مالی سال ۲۰۰۱۔۲۰۰۲ کے پہلے ماہ میں کھاد کی درآمد میں تقریباً ۳ ہزار فیصد اضافہ ہوا [۸]۔

حکومت نے وعدہ کیا ہے کہ کپاس کی درجہ بندی اور معیار قائم کرنے کی خاطر قانون سازی کی جائیگی اور کپاس کی تجارت کرنے والے سرکاری ادارے دی ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان کو بجٹ میں دی جانے والی امداد اور قرض کے ضمن میں دی جانے والی چھوٹ کا بھی خاتمہ کیا جائے گا تا کہ نجی شعبہ میں مقابلہ کرنے کی سکت پیدا کی جاسکے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہاں نجی شعبے سے مراد ملکی کی بجائے بڑی بڑی غیر ملکی بین الاقوامی اور زرعی کمپنیاں ہیں کیونکہ زراعتی معاہدے کی وجہ سے غیر ملکی کمپنیوں کو مراعات فراہم کرنے کے بعد ملکی نجی شعبے کا کردار برائے نام رہ جائے گا۔

ایک تبصرہ نگار کے مطابق موجودہ فوجی حکومت کا ایشیائی بینک کے ساتھ کیے گئے معاہدے کے منفی سیاسی اثرات مرتب ہوں گے کیونکہ اگلے پانچ سالوں میں آنے والی جمہوری حکومتوں کو موجودہ معاہدے پر عمل درآمد کرنے ہوں گے۔ اس طرح اتنے بڑے پیمانے پر عوام دشمن اقدامات ایک جمہوری حکومت کیلئے سیاسی طور پر تباہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔

بارش کی وجہ سے پانی کی کمی، کھاد، بیج، کیڑے مار ادویات پر جی ایس ٹی کے نفاذ اور قیمتوں میں اضافہ، تیل، بجلی اور گیس کی شرحوں میں اضافہ کے باعث کسانوں کے اخراجات میں اضافہ اور اہم زرعی اور دیگر اجناس مثلاً گندم، چاول، گنا وغیرہ پر دی جانے والی امدادی قیمتوں کے خاتمے کے علاوہ غیر ملکی مصنوعات پر درآمدی ڈیوٹی میں کمی ایسے اقدامات ہیں جس سے کسان کے پیدا کردہ اشیاء کی قیمتوں میں کمی سے معاشی ہی نہیں سماجی مسائل جنم لے رہے ہیں مثلاً کاشتکاری ترک کر کے کسان شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔ لسانی اور مذہبی لڑائیوں کے ساتھ ساتھ بیروزگاری، مہنگائی اور غربت میں اضافہ ایسے عوامل ہیں جن کو آزاد تجارتی پالیسیوں سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان تمام مسائل کے علاوہ ایک اور سنگین مسئلہ گھرانے اور ملکی سطح پر تحفظ خوراک کا ہے۔ سبز انقلاب کے بعد سے نقد آور فصلوں اور برآمدی تجارت کو بڑھانے کی طرف ہماری منصوبہ بندی نے شہر اور دیہات، دونوں کی سطح پر اس مسئلہ کو خطرناک حد تک متاثر کیا ہے۔ نقد آور فصلوں مثلاً کپاس اور گنے کی تجارتی بنیادوں پر کاشت سے قبل پاکستان کی دیہاتی آبادی کا مسئلہ اتنا سنگین نہیں تھا کیونکہ لوگ اپنی خوراک کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے فصلیں اگاتے تھے۔ ۱۹۹۰ کے بعد آزاد تجارتی اصولوں نے منڈی کی خاطر اجناس پیدا کرنے کے رجحان کو تیز تر کر دیا ہے، جس نے گھرانے کی سطح سے لیکر ملکی سطح پر تحفظ کے مسئلہ کو بڑھایا ہی نہیں بلکہ انتہائی سنگین بنا دیا ہے۔ اے ڈی بی کے ساتھ کیے گئے حالیہ معاہدے کی وجہ سے اگلے پانچ سالوں میں حکومت پاکستان کو ایسے اقدامات کرنے ہوں گے جس کے پاکستانی عوام پر بالعموم اور کسان آبادی پر بالخصوص تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے۔

اے ڈی بی دراصل عالمی اداروں ہی کے ایجنڈے کو آگے بڑھا رہی ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ اے ڈی بی میں سب سے بڑے حصہ دار امریکہ اور جاپان ہیں جن کا تعلق جی-۷ گروپ سے ہے جن کی پالیسیوں کا مرکز بین الاقوامی کارپوریشنوں کا مفاد ہے۔ دنیا کی ۵۰۰ بڑی بین الاقوامی کمپنیوں میں سے ۱۸۵ بین الاقوامی کمپنیوں کا تعلق صرف امریکہ اور ۱۰۴ کا تعلق جاپان سے ہے یعنی مجموعی طور پر ۵۷ء۸ فیصد کمپنیوں کا تعلق صرف ان دو بڑے سرمایہ دار ممالک سے ہے[9]۔ یہی ممالک عالمی بینک، آئی ایم ایف اور ڈبلیو ٹی او کی پالیسیوں کو بھی بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ دونوں ممالک اس وقت سرمایہ دارانہ معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اور دونوں ہی آزاد تجارت کی معاشی پالیسیوں کو فروغ دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان وجوہات کی بناء پر اے ڈی بی کی پالیسیاں کسی بھی طرح آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور ڈبلیو ٹی او سے مختلف نہیں ہیں۔

اے ڈی بی نے پاکستان کو دیئے جانے والے قرضہ میں واضح طور پر تسلیم کیا ہے کہ موجودہ قرضہ کا مقصد زراعت میں نجی شعبہ کو آگے بڑھانا اور حکومتی کنٹرول کا خاتمہ ہے۔ یہی نعرہ آزاد تجارت کے فروغ کے سب سے بڑے اور مضبوط ادارے عالمی تجارتی ادارے (ڈبلیو ٹی او) کا ہے، اس کا ایک اہم معاہدہ زراعت کا معاہدہ (اے او اے) ہے۔ اس معاہدے کے تحت تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے ممالک آزاد تجارتی اصولوں کے مطابق مرحلہ وار اقدامات کرتے ہوئے زراعت کی ضمن میں ایسے اصلاحات کریں گے جن میں عوام اور کسانوں کو دی جانے والی ہر قسم کی امداد اور چھوٹ کا خاتمہ، ملکی منڈیوں کا غیر ملکی کارپوریشنوں کیلئے کھولنا اور درآمدات پر عائد ہر قسم کے ٹیکسوں کا خاتمہ شامل ہیں۔ یہ کوئی اتفاق کی بات نہیں ہے کہ اے ڈی بی نے اس مقصد کیلئے سال ۲۰۰۶ کا انتخاب کیا ہے، اے او اے کے معاہدے کے تحت سال ۲۰۰۵ ترقی پزیر ممالک کے زرعی منڈیوں کو مکمل طور پر کھولنے اور ہر قسم کے مراعات کے خاتمے کے لیے چنا گیا ہے، جس طرح دونوں اداروں کے شرائط ایک ہیں اسی طرح مقاصد اور اصلاحات کے دورانیہ کا انتخاب بھی کم و بیش ایک ہے۔ اسی لیے اگر اے ڈی بی کے قرضہ سے مشروط شرائط اور اے او اے کے شرائط کا موازنہ کیا جائے تو اس میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ اس طرح واضح ہوتا ہے کہ اے ڈی بی کا زراعت کے ضمن میں دیئے جانے والے حالیہ قرضہ کا سب سے اہم مقصد ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (ڈبلیو ٹی او) کے زراعت کے معاہدے (اے او اے) کے ایجنڈے کو آگے بڑھانا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ پاکستانی زرعی شعبے کی آزادی، ۱۳ دسمبر، ۲۰۰۱، (www.adb.org)

۲۔ زرعی شعبے کا پروگرام ۲ خبر اور واقعات، ۱۳ دسمبر، ۲۰۰۱، (www.adb.org)

۳۔ ڈان، ۹ اپریل، ۲۰۰۲۔

۴۔ ڈان، ۱۲ اپریل، ۲۰۰۲۔

۵۔ دی نیوز، ۱۸ مئی، ۲۰۰۱۔

۶۔ ڈان، ۲ اگست، ۲۰۰۱۔

۷۔ دی نیوز، دسمبر، ۲۹-۲۰۰۱۔

۸۔ جنگ، ۱۳ اگست، ۲۰۰۱۔

۹۔ ایڈواچ، اے پی آر این، کارپوریٹ پاور آر پیپلز پاور: ٹی این سیز اینڈ گلوبلائزیشن ۲۷-۲۹ دسمبر ۲۰۰۱، ورکشاپ پیپرز

زرعی سرمایہ کاری پالیسی: سرکار، جی۔۸ اور بین الاقوامی کمپنیوں کا گٹھ جوڑ

عذرا طلعت سعید

تیسری دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی ترقی یافتہ ممالک کے صف میں شامل ہونے کے لیے معاشی ترقی کو اپنانے پر زور دیا جاتا ہے۔ حکومت معاشی ترقی کے حصول کے لیے سرمایہ کاری کی ایسی پالیسیاں اپنائے ہوئے ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہیں۔ غیر ملکی سرمایہ کاری کے حصول کی خاطر ملک میں پر کشش مراعات دیے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں دیگر وزارتوں اور محکموں کی طرح وفاقی وزارت زراعت و مال مویشی (مین فال) نے بھی ملک میں سرمایہ کاری کے فروغ کے لیے یہاں موجود وسائل اور اثاثہ جات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جس میں قابل کاشت زمین، مختلف فصلیں (گندم، کپاس، چاول، پھل اور سبزیاں)، ماہی پروری اور مال مویشی شامل ہیں۔ حکومت نے جن مخصوص شعبوں میں سرمایہ کاری کی نشاندہی کی ہے ان میں: ماہی پروری سے جڑی ہوئی صنعتیں، بھیڑ اور بکرے کے گوشت کی پیداوار، ڈیری کی مصنوعات کا کاروبار (دودھ اور اس سے بننے والی اشیاء کا کاروبار)، خشک سبزیوں کی پیداوار، ٹماٹر کی چٹنی (ٹماٹو پیسٹ) کے علاوہ سورج مکھی کی مصنوعی بیج کی پیداوار شامل ہے[1]۔

زراعت میں سرمایہ داری نظام کی طرف پیش قدمی تیز کرنے کی خاطر حکومت پاکستان نے سرمایہ کاری کے لیے ایسی زرعی پالیسی اپنائی ہے جس میں کارپوریٹ طریقہ کاشتکاری (کارپوریٹ فارمنگ) بھی شامل ہے۔ کارپوریٹ طریقہ کاشتکاری کے تحت منظور شدہ زرعی کمپنیوں کے زمین حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں، وہ جتنی زمین چاہے خرید سکتی ہیں یا لیز پر لے سکتی ہیں۔ لیز کی مدت پہلے مرحلے میں ۵۰ سال ہوگی جبکہ اس مدت کو مزید ۴۹ سال تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ غیر ملکی کمپنیاں سو فیصد حصے دار بن سکتی ہیں اور انھیں منافع اور سرمائے کو ملک سے باہر بھیجنے کی مکمل آزادی بھی حاصل ہوگی۔ جو زرعی کمپنیاں کارپوریٹ فارمنگ میں حصہ لینا چاہیں گی، ان کو مختلف بینک قرضہ جات کی اسکیم فراہم کریں گے۔ زراعت کے شعبے سے متعلق مشینری کی درآمد پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جائے گا۔ اس کے علاوہ برآمدی پیداوار کے لیے جو بھی خام مال درآمد کیا جائے گا اس پر درآمدی ٹیکس نافذ نہیں کیا جائے گا۔

پاکستان سرمایہ کاری بورڈ نے مختلف زرعی اشیاء کی پیداوار اور مارکیٹ میں کامیابی کے امکانات کی نشاندہی کی ہے مثلاً بیج کی پیداوار کے لیے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ فی کیلوگرام بیج ۲۵۰ سے ۳۰۰ روپے تک کسانوں کو بیچی جا سکتی ہے۔ اس قیمت میں ۱۰۰ سے ۱۳۰ روپے فی کیلوگرام منافع شامل ہے یعنی منافع کی شرح ۴۰ سے ۴۳ فیصد تک بتائی گئی ہے۔ ہر چیز کی برآمدی صلاحیت کی اہمیت کو مدنظر رکھا گیا ہے مثلاً گوشت، مچھلی، پھلوں کا جوس اور خشک دودھ جیسی اشیاء کو اسی وجہ سے پیداوار میں خاص جگہ دی گئی ہے۔

ماہی پروری کے حوالے سے اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ پاکستان کے پاس تقریباً ۲۵۰،۰۰۰ مربع کیلومیٹر کا رقبہ موجود ہے۔ خیال یہ ہے کہ پاکستان کی ماہی گیری زون میں کئی طرح کی سمندری مچھلیاں موجود ہیں اس لیے بین الاقوامی سرمائے کو اس شعبے کی طرف راغب کرنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئے گی۔ تازہ مچھلی کے علاوہ کھانے کے لیے نیم تیار شدہ یا تیار شدہ مچھلی کی مارکیٹ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ مصنوعی طور پر جھینگے کے افزائش اور پیداواری نظام کو پاکستان میں قائم کرنے کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ اگر چہ پاکستان میں اب تک اس طرز کی جھینگے کی پیداوار نہیں ہوتی ہے لیکن بتایا گیا ہے کہ بنگلہ دیش میں بھی ۱۹۷۰ کے بعد ہی جھینگے کی پیداوار اس طریقے کار کے مطابق شروع کی گئی اور اب اس کا شمار بنگلہ دیش کے ایک اہم پیداواری یونٹ میں ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ پاکستانی حکومت شعبہ زراعت کو کارپوریٹ فارمنگ یا سرمایہ داری نظام کے حوالے کرنے پر تیار بیٹھی ہے۔ بظاہر یہ تمام منصوبہ بندی اور معاشی ترقی پر مبنی اقدامات اتفاقی اور پاکستانی حکومت کے وضع کردہ پالیسیوں کا حصہ نظر آتی ہیں لیکن کارپوریٹ فارمنگ کا نفاذ بین الاقوامی زرعی کمپنیوں کی پر زور دباؤ کے تحت ہو رہا ہے۔ عالمی زراعتی معاہدہ جو کہ ڈبلیو ٹی او کے تحت نافذ کیا گیا ہے انہی کمپنیوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ عالمی سطح پر زراعت اور اناج سے وابستہ کاروبار اور تجارت پر صرف ۵ بین الاقوامی کمپنیوں کا قبضہ ہے جب کہ ۱۰ بین الاقوامی کمپنیاں پوری دنیا میں استعمال ہونے والے ۴۰ فیصد بیج پر ملکیت کے اختیارات رکھتی ہیں[2]۔ دنیا پر بین الاقوامی کمپنیوں کے شکنجے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۹۰ فیصد ٹیکنالوجی پر ان ہی کی گرفت ہے۔ دنیا میں موجود زیادہ تر اثاثے کی مالک ۱۰۰ بین الاقوامی کمپنیاں ہیں۔ ۲۰۰۰ میں ان کی کل آمدنی ۶ء۶ ٹریلین ڈالرز تھی[3]۔ ان میں سے ۹۰ فیصد بین لاقوامی کمپنیوں کا تعلق امریکہ (۶۱ فیصد)، یورپ (۳۳ فیصد) اور جاپان (۲ فیصد) سے ہے[4]۔ دنیا بھر میں ان بین الاقوامی کمپنیوں کی طاقت اور اس کے آمرانہ استعمال پر شدید احتجاج ہو رہا ہے۔ یہ کمپنیاں اپنی معاشی طاقت کے ذریعے اپنی حکومتوں کی سرمایہ دارانہ پالیسیوں کو نافذ کروانے میں برابر کی شریک ہیں۔ عالمی سطح پر ڈبلیو ٹی او کے تحت زراعت کے حوالے سے دو سنگین معاہدے نافذ ہوئے ہیں، ان میں عالمی زراعتی معاہدہ (اے او اے) اور

ذہنی ملکیت کا معاہدہ (ٹرپس) شامل ہیں۔ نہ صرف یہ دو معاہدے بلکہ ڈبلیو ٹی او خود بھی ان کمپنیوں کے حقوق کی حفاظت اور دنیا کے ہر ملک میں تجارت کے حوالے سے زبردستی گھسنے کے لیے بنایا گیا ہے۔

پاکستان سمیت ڈبلیو ٹی او کے دیگر تمام ممبر ممالک نے عالمی زراعتی معاہدے کے تحت بین الاقوامی کمپنیوں کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ جدید سرمایہ دارانہ طریقوں اور اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے زرعی پیداوار اور کاروبار کریں۔ اوپر پیش کی گئی تفصیلات سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان، ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ ملکر ملک میں بین الاقوامی زرعی کمپنیوں کے تسلط کو نافذ کرنے میں پوری طرح ملوث ہے۔

اس سازش کی اگلی کڑی اس وقت کھل کر سامنے آئے گی جب پاکستانی حکومت پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ کو مکمل کر کے ملک میں نافذ کرے گی۔ ۱۹۶۱ میں یو پی او وی کنونشن دراصل نئی طرح کے بیج اور فصلوں کو بنانے والے کاشتکاروں کو اپنی ایجادات پر خاص تحفظ فراہم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس کنونشن سے حاصل شدہ مسودے کو ۱۹۷۲، ۱۹۷۸ اور ۱۹۹۱ میں نئی ترامیم کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بین الاقوامی زرعی کمپنیوں کے مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے اصل مسودے میں آخری ترمیم ۱۹۹۱ میں کی گئی۔ اس مسودے کے تحت اگر کوئی کاشتکار ایسی بیج استعمال کرتا ہے جس کا حق ملکیت کا معاوضہ (رائلٹی) اس نے بیج کے ''ذہنی مالک'' کو نہیں دیا ہے تو وہ فصل کھو سکتا ہے اور بیج کا ''مالک'' اس فصل کا حقدار بن سکتا ہے۔ یو پی او وی ۱۹۷۸ کے تحت کاشتکار کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ بیج کو آئندہ فصل اگانے کے لیے محفوظ کر سکتے تھے۔ لیکن ۱۹۹۱ کی نئی ترمیم کے بعد صورت حال ایسی ہے کہ کاشتکار ذہنی ملکیت رکھنے والی بیج کو اس وقت ہی استعمال کر سکتا ہے جب اس کے اپنے ملک کی حکومت نے اپنے پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ میں اس حق کو محفوظ رکھا ہو[۵]۔

جنرل مشرف نے پچھلے سال مختلف غیر ملکی بین الاقوامی زرعی کمپنیوں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد ہی پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ کو ملک میں نافذ کر دیں گے[۶]۔ اس ایکٹ کے نافذ ہوتے ہی بین الاقوامی کمپنیاں جینیاتی انجیئرنگ کے تحت بنی بیج کو ملک بھر میں استعمال کرنا شروع کر دیں گی۔ شائد ہمارے ملک کے رہنماؤں کو یہ علم نہیں ہے کہ جینیاتی انجیئرنگ سے حاصل کی ہوئی بیج وفصل کے استعمال پر دنیا بھر کے سائنس دان، کاشتکار اور عوام سخت پریشان اور خوف زدہ ہیں۔ سائنسی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ یہ بیج ماحول اور صحت، دونوں کو بے تحاشہ نقصان پہنچا سکتی ہے۔ یہ یاد رہے کہ ایک بین الاقوامی معاہدے، کارٹیجینہ پروٹوکول کے تحت جینیاتی انجیئرنگ سے حاصل کردہ بیج، پودے اور جانوروں کی پیداوار پاکستان میں روک سکتے ہیں۔

مونسانٹو بہت بڑی بین الاقوامی زرعی کمپنی ہے، جس نے کپاس کی فصل کے لیے ایک نئی جینیاتی بیج بی ٹی کاٹن ایجاد کیا ہے اور اس کی حق ملکیت کی دعوے دار ہے۔ پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ نافذ ہوتے ہی مونسانٹو اس بیج کا استعمال پاکستان میں شروع کر سکتی ہے۔ بھارتی حکومت نے بی ٹی کاٹن کے استعمال کی پہلے ہی اجازت دے دی ہے۔ اس اجازت نامے پر بھارتی کاشتکاروں نے سخت مزاحمت ظاہر کرنے کا اعلان کیا ہے۔ کچھ گروہوں کا کہنا ہے کہ جہاں جہاں پر بی ٹی کاٹن سے فصل اگائی جائے گی اس کو جلا دیا جائے گا۔ دنیا بھر سے اس بیج کی کاشت سے فصلوں اور ماحول کو نقصان پہنچنے کی خبریں آرہی ہیں۔

فی الحال پاکستان میں پلانٹ بریڈرز رائٹس کا ایک نامکمل مسودہ موجود ہے جو بین الاقوامی کمپنیوں کے حق میں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اس مسودے کو تبدیل کر کے ایسا مسودہ تیار کرے جو کہ ملک کے چھوٹے کاشتکار کے حق میں ہو مثلاً دیکھنے کی ضرورت یہ ہے کہ آج کل جینیاتی بیج کے علاوہ بھی مصنوعی بیج کے ذہنی ملکیت کے حقوق کس کے پاس ہیں؟ اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ آسٹریلیا اور اسرائیل سمیت ترقی یافتہ ممالک میں آم کی نئی فصلوں کو پلانٹ بریڈرز رائٹس کے تحت کاشت کیا جا رہا ہے اور نئے اقسام اگائے جا رہے ہیں[۷]۔ لیکن ان میں سے ہر ایک نئے قسم کے پودے کا جینیاتی مادہ، ان ہزاروں آم کے پودوں کی اقسام سے لیا گیا ہے جو کہ تیسری دنیا کے کاشتکاروں نے صدیوں سے آم کے مختلف پودوں کے بیج سے ملا کر پیدا کیے ہیں۔ ایک طرف تیسری دنیا کے کاشتکاروں کی ہزاروں سال کی محنت، تجربہ اور ذہنی ملکیت کا اب کوئی محافظ نہیں اور دوسری طرف چند دہائیوں کی تحقیق کی بنیاد پر نئے پودوں کا مکمل حق پہلی دنیا کی زرعی کمپنیوں سے جڑے ہوئے صنعتی کاشتکاروں کو دے دیا گیا ہے۔ اس طرح سے اگر اب ہم نئے پودوں کی مصنوعی بیج کو استعمال کرتے ہیں تو ہمیں بیج کے مالکوں کو رائلٹی دینی پڑے گی۔ ہمارے ملک میں ۹۳ فیصد سے زائد چھوٹے کاشتکار ہیں اور انہی کی انتھک محنت کی بنیاد پر پورا ملک غذا حاصل کرتا ہے۔ اگر ہم ان کے حقوق کی حفاظت نہیں کریں گے تو نہ صرف ان کاشتکاروں کے روزگار اور غذائی ضروریات بلکہ پورے قوم کی تحفظ خوراک سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ بڑی بڑی کارپوریشنوں کو غلہ اگانے اور تحفظ خوراک سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ ان کا مقصد صرف منافع کمانا ہے۔ اسی لیے یہ کمپنیاں نقد آور برآمدی فصلوں کو اگانے پر زور دیتی ہیں۔

زراعت کے بارے میں سرمایہ کاری پالیسی کے تحت حکومت پاکستان نے بین الاقوامی کمپنیوں کی ترغیب کے لیے کھل کر اپنا زرعی اثاثہ بیان کیا ہے مثلاً ماہی گیری سے پکڑی جانے والی مچھلی ۵ء۷ ملین ٹن، بھینس کی کل تعداد ۲۳ ملین، بھیڑ اور بکری ۵ ۷ ملین اس کے علاوہ یہ کہا گیا ہے کہ دودھ اور دودھ سے بنی ہوئی اشیاء پاکستان میں دوسرے ممالک کی بہ نسبت بہتر مقدار میں حاصل ہوتی ہیں۔ حکومت پاکستان کا خیال ہے کہ دودھ پیدا کرنے والے جانوروں کا جینیاتی مواد بہت اچھا ہے۔ آج کل سرمائے کے لیے جینیاتی مواد ایک نہایت اہم منافع بخش کاروبار تسلیم کیا جاتا ہے۔ ٹرپس اور یو پی او وی ۱۹۹۱ کی بنیاد اس مواد کو حاصل کرنا اور جینیاتی انجیئرنگ کے تحت مختلف جانور اور پودوں کی پیداوار پر بین الاقوامی کمپنیوں کے ذہنی ملکیت کو رائج کرنا ہی ہے۔ جب ہم ایسا

پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ نافذ کردیں گے جو کہ بین الاقوامی کمپنیوں کو اس کا حق دار بنائے گا کہ وہ ہمارے ملک کے جینیاتی مواد کو حاصل کرکے اپنی ملکیت بنالے نتیجتاً غریب کسان ہر طرح کے اثاثہ سے محروم ہوجائے گا۔ ایسی گائے یا بھینس کی جینیاتی انجینئرنگ کے تحت پیداوار کی جائے گی جن پر کسان کا کوئی حق نہیں رہے گا۔ یہ زرعی کمپنیوں کی ملکیت ہوجائے گی۔ اس طرح سے ہمارے کسان ان جانوروں اور پودوں پر سے اپنا اختیار کھودیں گے جو کہ ہزاروں سال کی کاوش سے آج دنیا میں اپنی بہتر جینیاتی خصوصیات کے لیے مشہور ہیں۔

حکومت پاکستان اپنی سرمایہ کاری کے لیے دی گئی ترغیبات کے پرچار میں بڑی فخر سے کہتی ہے کہ پاکستان میں غیر ملکی سرمایہ کے لیے ایک پرکشش ماحول ۱۴۰ ملین شہریوں کی وجہ سے بھی پایا جاتا ہے۔ اس آبادی کی بڑھتی ہوئی قوت خرید کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ غیر ملکی کمپنیوں کی اشیاء کی فروخت کے لیے ایک بڑی مارکیٹ موجود ہے اور اس طرح یہ کمپنیاں یہاں مال فروخت کرکے منافع کمانے میں کامیاب ہوسکتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے حکومت پاکستان کسی اور ہی ملک اور اس کے باشندوں کا ذکر کررہی ہو۔ شائد سرکار یہ بھول گئی ہے کہ اس کے اپنے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں ۴۷ فیصد لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارتے ہیں[۸]، مزید یہ کہ پچھلے ۱۰ سالوں میں غربت کی لکیر سے نیچے رہنے والوں کی تعداد ۱۰ فیصد بڑھی ہے۔ غربت بڑھنے کی ایک اہم وجہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے تجویز شدہ نج کاری کی پالیسیاں بھی ہیں۔ پوری دنیا میں کہیں پر بھی آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی ان پالیسیوں کے تحت غربت میں کمی نہیں آئی بلکہ ہر خطے سے غربت اور افلاس بڑھنے کی خبریں موصول ہورہی ہیں۔ خود ورلڈ بینک بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اس کی پالیسیوں کے باعث غریب عوام کو مزید مفلسی کا سامنا ہے۔ اس کے علاوہ بے تحاشہ رپورٹس اور تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ عالمی زراعتی معاہدے اور آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی مختلف پالیسیاں بہت تیزی سے تیسری دنیا کے زرعی ممالک میں معاشی اور معاشرتی ترقی لانے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں حکومت پاکستان کا یہ خیال ہے کہ ہماری ۱۴۰ ملین عوام کی قوت خرید میں اضافہ ہونے والا ہے، انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی معاشی پالیسی کو نج کاری اور سرمایہ دارانہ نظام کے حوالے کرنے کے بجائے عوام کی خوش حالی کو مدنظر رکھ کر بنائیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم قدم یہ ہوسکتا ہے کہ پاکستان، تیسری دنیا کے دیگر ممالک کے ساتھ مل کر اس بات پر ڈٹ جائے کہ زراعت اور ٹرپس کے معاہدے ڈبلیو ٹی او سے مکمل طور پر خارج کردیے جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سارے عارضی اور نامکمل ترکیبیں ہیں کیونکہ جب تک کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت پالیسیاں مرتب کی جائیں گی غریب کا استحصال ختم نہیں ہوسکتا۔ سرمائے کی بنیاد مزدور اور کسان کی محنت پر قبضہ ہے۔ اس لیے جب تک اس نظام کا مکمل طور پر خاتمہ نہیں کیا جائے گا، انسانی فلاح و بہبود کے لیے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی۔

حوالہ جات:

۱۔ (http://www.pakboi.gov.pk)

۲۔ ایڈواچ، اے پی آر این، کارپوریٹ پاور آر پیپلز پاور: ٹی این سیز اینڈ گلوبلائیزیشن ۲۷-۲۹، ستمبر ۲۰۰۱، ورکشاپ پیپرز، صفحہ ۱۸۔

۳۔ کنول جیت سنگھ، نیولبرل گلوبلائیزیشن اینڈ ڈیموکریسی: کریٹیکل ایشوز اینڈ پرسپیکٹیوز، پبلک انٹریسٹ ریسرچ سینٹر، دہلی، ۲۰۰۲۔

۴۔ جیمس پیٹراس اینڈ ہنری ویلٹمیئر، گلوبلائزیشن ان ماسکٹ، زیڈ بکس، ۲۰۰۱، صفحہ ۶۲۔

۵۔ رابرٹ علی بریک ایٹ آل، بریو نیو سیڈز، زیڈ بکس، ۲۰۰۰، صفحہ ۹۹۔

۶۔ ڈاکٹر عابد سلہیری، دی نیوز، کراچی، یکم جولائی، ۲۰۰۱۔

۷۔ ایم ایچ پھنور اور فرزانہ پھنور، ایکونومک اینڈ بزنس ریویو، ڈان، کراچی، ۹ دسمبر، 1995۔

۸۔ گورنمنٹ آف پاکستان پلاننگ کمیشن، تھری ایئر پاورٹی رڈکشن پروگرام ۲۰۰۱-۲۰۰۴، اسلام آباد ۲۰۰۱۔

زراعت کا تاریک مستقبل: روشن ملک کے ساتھ گفتگو سے اقتباس

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ملک میں ۹۳ فیصد کھیتی باڑی کرنے والے چھوٹے کاشتکار ہیں، جنکی ملکیت زمین ۱۲٫۵ ایکڑ سے کم ہے۔ یہ کاشتکار اپنی خوراک کی ضرورت پورے کرنے کی خاطر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ زیادہ پیداواری لاگت کی وجہ سے ان کے لیے گزارہ کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ لیکن خود اناج پیدا کرنے کی وجہ سے انہوں نے تحفظ خوراک کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے اور اس طرح حکومت کو اس مسئلہ سے کسی حد تک بری الزمہ کردیا ہے۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کے ۱۹۹۸ کے رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر سال غربت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ تحفظ خوراک کے غیر محفوظ ہونے میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ اس صورتحال کو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (ڈبلیو ٹی او) کے معاہدے خاص طور پر زراعت کا عالمی معاہدہ (اے او اے) اور تجارت سے متعلق ذہنی ملکیت کا معاہدہ (ٹرپس) مزید گھمبیر بنارہے ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر حال ہی میں روزنامہ ڈان نے گلوبلائیزیشن کے خلاف سرگرم فرد روشن ملک سے گفتگو کی۔ جس میں انہوں نے آزاد تجارت اور ملکی زراعت سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ بہت جلد کم ترقی پزیر ممالک میں ملکی قوانین کی جگہ بین الاقوامی قوانین لے لیں گے اور یہ پاکستان جیسے ممالک کے لیے ایک مشکل صورتحال کو جنم دیگی اور یہ کہ اے او اے کے تحت کم ترقی یافتہ اور ترقی پزیر ممالک میں بین الاقوامی کمپنیوں کو مقامی طور پر زرعی اشیاء پیدا کرنے والوں پر سبقت حاصل ہوجائے گی۔ ترقی پزیر ممالک کو پابند بنادیا گیا ہے کہ وہ اپنی زراعت کے شعبے کی امداد کے طور پر عائد کرنے والے درآمدی ٹیکس کم کردیں جبکہ امریکہ اور یورپ کے ترقی یافتہ ممالک کو انتہائی چالاکی کے ساتھ مقامی امداد کے بہانے سے ان پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دے دیے گئے ہیں۔ روشن ملک نے ٹرپس کے معاہدے کے مضمرات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس معاہدے کے تحت بیج پر بین الاقوامی کمپنیوں کے حق ملکیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد خلاف ورزی کرنے والے کسانوں کے خلاف قانونی کاروائی کی جائے گی۔ بین الاقوامی کمپنیوں نے ان قوانین سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی پودوں کے حقوق ملکیت حاصل کرلیے ہیں جن میں باسمتی چاول، نیم، ہلدی، انار اور سرسوں شامل ہیں۔ اب تجارت سے متعلق ذہنی ملکیت کے معاہدے (ٹرپس) کے تحت کسان اگر ان بیجوں کا استعمال کریگا تو اسکے خلاف قانونی کاروائی ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ گلوبلائیزیشن کا مطمع نظر پاکستان جیسے ترقی پزیر ممالک میں کارپوریٹ طریقہ زراعت متعارف کروانا ہے، جس کے نتیجے میں مقامی کاشتکار مقابلہ سے خارج ہوجائے گا جس کے بعد اس کے پاس اپنی زمین کو بڑی کارپوریشنوں کے ہاتھوں بیچنے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچے گا۔ روشن ملک نے زور دیکر کہا کہ ''جس چیز کو لوگ نہیں سمجھ رہے ہیں وہ ڈبلیو ٹی او، عالمی زراعتی معاہدہ اور ٹرپس جیسے معاہدوں کی صورت میں منڈلاتے ہوئے وہ خطرات ہیں جس کی وجہ سے مکمل معاشی و سماجی تبدیلی واقع ہوگی۔''

(ڈان، کراچی، ۳، اپریل ۲۰۰۲)

نیم کے مفید اثرات اور استعمال: ڈاکٹر غلام جیلانی سے گفتگو

چیلنج رپورٹ

پاکستان کے زرعی مسائل، اسباب اور حل کے بارے میں جمعرات ۲۴ جنوری کو ملک کے ایک ممتاز زرعی ماہر جناب ڈاکٹر غلام جیلانی کے ساتھ روٹس فار ایکوٹی آفس واقع ٹنڈو محمد خان میں ایک گفتگو کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے برصغیر کے مشہور عام درخت نیم پر امریکہ میں تحقیق مکمل کی۔ آپ نے زہریلی ادویات اور نیم کے جراثیم کش اثرات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ یہاں ہم اس گفتگو کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے نیم کی اہمیت بیان کی اور بتایا کہ یہ پودا ہمارے ملک میں عام دستیاب ہے۔ اس کی بے شمار خوبیوں میں سے کسان کیلئے اس کی ایک کارآمد خوبی اس کی جراثیم کش خصوصیت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق نیم میں پائی جانے والی اس خصوصیت کو استعمال کرتے ہوئے نہ صرف کسان کو بہت بڑا مالی فائدے حاصل ہو سکتا ہے بلکہ یہ ماحول، چرند، پرند اور کسان کی اپنی صحت کیلئے بھی کارآمد ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب کے مطابق کسان کیلئے ضروری ہے کہ وہ دوست اور دشمن کیڑے کی پہچان رکھیں۔ فصل پر پائے جانے والے ہر قسم کے کیڑے فصل کے لیے نقصان دہ نہیں ہوتے۔ دوست اور دشمن کیڑوں کی پہچان یہ ہے کہ دشمن کیڑا پتہ پھول یا فصل کھاتا ہے، جبکہ اس کے برعکس دوست کیڑے دوسرے کیڑوں یا فصل پر حملہ کرنے والے کیڑوں کو خوراک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کیمیائی طور پر استعمال ہونے والے جدید کیڑے مار ادویات سے دوست اور دشمن، دونوں قسم کے کیڑے مارے جاتے ہیں۔

صحت، زمین کی زرخیزی، چرند، پرند اور ماحولیاتی نقصان کے ساتھ ساتھ پانی کے بحران کے پیش نظر ضروری ہے کہ مصنوعی طور پر تیار کردہ جدید کیڑے مار ادویات کے بجائے صدیوں سے آزمودہ اور مقامی سطح پر آسانی سے دستیاب اور سستا طریقہ جراثیم کش نیم کے استعمال کو بڑھایا جائے۔

نیم کے بیج سے پاؤڈر بنانے کے علاوہ خشک بیج سے تیل بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ نیم کے تیل کی مدد سے بنائی ہوئی جراثیم کش دوا کھیت میں شام چار بجے کے قریب اسپرے کریں۔ اسپرے کے بعد کیڑے کھیت سے فرار ہو جاتے ہیں۔ نیم کے اسپرے سے کیڑا نہیں مرتا بلکہ نیم کے بخارات سے کیڑا اچنا چاہتا ہے اس کے علاوہ کڑوا ہونے کی وجہ سے کیڑا اس کو کھانے سے بھی معذور ہو جاتا ہے۔ اگر تھوڑا بہت کھائے گا تو نیم کے اثرات کی وجہ سے کیڑے کے بچے (لاروا) مزید بڑھنے کی قوت سے محروم ہو جاتے ہیں اور افزائش رکنے کی وجہ سے اگلے مرحلہ میں داخل نہیں ہو پاتے۔

نیم کے اسپرے سے دشمن کیڑے کو نقصان پہنچتا ہے کیونکہ اس سے وہ سست پڑ جاتا ہے اور بھاگ نہیں پاتا جس کی وجہ سے دوست کیڑوں کو انہیں کھانے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس طرح نیم کے اسپرے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دوست یا فائدہ مند کیڑے طاقتور ہو جاتے ہیں اور فصل کو نقصان پہنچانے والے کیڑے کا شکار آسانی سے کرنے لگتے ہیں۔

ڈاکٹر غلام جیلانی کے مطابق انگریزی یا دیسی، ہر قسم کے کیڑے مار دوا کا اسپرے کرنے کے لیے صحیح حالات اور وقت کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ صحیح حالات اور وقت پر اسپرے کرنے کے کئی فوائد ہیں، اول اس سے کیڑے کو اس وقت مارا جاتا ہے جب وہ فصل کو نقصان پہنچانے کے قابل ہوتے ہیں، دوئم اس سے فصل اور ماحول کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ کم ہو جاتا ہے، سوئم بار بار اسپرے کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، چہارم اس سے کسان کا مالی نقصان کم ہوتا ہے اور فصل کے محفوظ ہونے کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے۔

اسپرے کب کرنا چاہیے؟ زرعی ماہرین اور کیڑے مار ادویات تیار کرنے والی کمپنیوں کے بقول اسپرے اس وقت کرنا چاہیے، جب یہ محسوس ہو جائے کہ اب کیڑا فصل کو نقصان پہنچا سکتا ہے، اس کو ''معاشی حد'' کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مشورہ ہے کہ معاشی حد کا درست تعین کرنے کیلئے کسان کا بذات خود فصل یا کھیت کا مشاہدہ کرنا ضروری ہے مثلاً کپاس کی فصل کی معاشی حد معلوم کرنے کیلئے کھیت میں جائیں اور دس پتوں کا معائنہ کیا جائے، ان پر کیڑے گنیں، پتوں کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کا انتخاب کھیت کے مختلف جگہوں سے کیا گیا ہو۔ اگر یہ معاشی حد ہم سفید مکھی یا تھیلے کیلئے معلوم کرنا چاہتے ہیں تو دس پتوں پر سفید مکھی کے چار کیڑے ''معاشی حد'' یا نقصان کی حد کی نشاندہی کرتے ہیں، اس وقت اسپرے کرنا چاہیے، اگر تعداد اس سے کم ہے تو اسپرے نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح تھیلے کیلئے معاشی حد ایک پتہ پر دو کیڑے ہیں۔

ڈاکٹر غلام جیلانی نے اسپرے کرنے کے اوقات کی نشاندہی بھی کی۔ کیمیائی کیڑے مار ادویات اور نیم، دونوں کے اسپرے کرنے میں وقت کا تعین کرنا بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ہر قسم کے اسپرے کیلئے بہترین وقت شام چار بجے کے بعد کا ہے۔ اس سے کسان کو کئی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں مثلاً اس وقت دھوپ کا زور کم ہو چکا ہوتا ہے اسلئے بخارات بننے کا عمل کمزور پڑ جاتا ہے اور اوس پڑنے کی وجہ سے دوا حل ہو کر مقدار میں بڑھ جاتی ہے۔ دن کو اسپرے کرنے سے نہ صرف دوا کے بخارات جلدی بنتے ہیں بلکہ چرند، پرند اور انسان بھی کھیتوں میں آتے جاتے ہیں جس سے ان کو نقصان پہنچتا ہے۔

خالی وعدے......خالی پیٹ: ایک تبصرہ

طاہرہ فہیم

خواتین کے عالمی دن کے موقع پر پیسٹی سائیڈ ایکشن نیٹ ورک ایشیاء پیسفک نے ایک کتاب ''خالی وعدے... خالی پیٹ: زراعت کے عالمی معاہدے اور آزاد تجارت کے تحفظ خوراک پر اثر'' کا اجراء کیا۔ اس کتاب کی تقریب رونمائی ملیشیاء کے علاوہ دوسرے کئی ممالک میں مختلف تنظیموں کی مدد سے مقامی طور پر بھی کی گئی۔ ملیشیاء میں اس کتاب کی رونمائی کے موقع پر پیسٹی سائیڈ ایکشن نیٹ ورک کی ڈائریکٹر نے کہا ''زراعتی معاہدے کے ۷ سال اور آزاد تجارت کے ۲۰ سال گزرنے کے بعد یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ وعدے جن کے تحت اس بات کی یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ کروڑوں عوام کے لیے تحفظ خوراک اور خوشحال زندگی یقینی ہے، صرف خالی وعدے ہی ثابت ہوئے ہیں۔''
پاکستان میں اس کتاب کی رونمائی خواتین کے عالمی دن کی مناسبت سے منائی جانے والی ایک تقریب میں کی گئی، یہ تقریب ۷ مارچ کو گوٹھ عبدالہادی نظامانی، تعلقہ ٹنڈو محمد خان میں منعقد ہوئی۔

کتاب میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جب عالمی زراعتی معاہدے کا انعقاد جدید آزاد تجارت کی بنیاد پر کیا جارہا تھا تو دنیا کے مختلف خطوں سے بے تحاشہ تنقید کی گئی تھی اور یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ دنیا بھر کے چھوٹے کاشتکار اور ہاری ان معاہدوں کی زد میں آئیں گے، بھوک اور بے روزگاری کثرت سے بڑھے گی۔ زراعت کے شعبے میں نجکاری اور جدید آزاد تجارت کا فائدہ صرف بڑی بڑی بین الاقوامی زرعی کاروبار سے وابستہ کمپنیوں اور بڑے بڑے زمینداروں کو ہوگا، لیکن ساری تنقید کو نظر انداز کرتے ہوئے ۱۹۹۵ میں ڈبلیو ٹی او کے تحت زراعتی معاہدے کو نافذ کردیا گیا تھا۔ اس معاہدے کے تحت ہر ملک کو اپنی درآمدی ٹیکس کو گھٹانا ہے، کسانوں کو دیے جانے والے مراعات کے ساتھ ساتھ ملک میں درآمدی غذا اور فصلوں سے پابندی کا خاتمہ شامل ہے۔

آج اس معاہدے کو نافذ ہوئے ۶ سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور اس عرصے میں دنیا بھر میں آزاد تجارت کی زرعی پالیسیوں اور تدبیروں کے خلاف سخت احتجاج اور تنقید کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کتاب میں درج تحقیقات اس احتجاج کے وزن میں اضافہ کرتے ہوئے تفصیلاً یہ ثابت کرتی ہے کہ عالمی زراعتی معاہدے کی وجہ سے تیسری دنیا کے ملکوں میں چھوٹے پیمانے کے کاشتکاروں، مزدوروں اور خاص کر خواتین میں غربت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور ان کی خوراک تک رسائی خطرناک حد تک متاثر ہوئی ہے۔ زراعت سے جڑا ہوا روزگار ختم ہوتا جارہا ہے اور کروڑوں کی تعداد میں لوگوں کو بھوک کا سامنا ہے۔ اس اذیت اور تکلیف کی بنیاد آزاد تجارت کے تحت تیسری دنیا کے ممالک میں سستی درآمدی غذا ہے جس کی وجہ سے کم زمین رکھنے والے کسان اور ہاری اپنی برسہا برس کی طرز زندگی اور روزی، دونوں سے ہاتھ دھو رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسان اور خاص کر عورتوں کے کام کے اوقات میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ کام میں سختی بھی آگئی ہے۔

آزاد تجارت کی وجہ سے زراعت میں استعمال ہونے والی اشیاء کی قیمتیں دن بہ دن بڑھتی جارہی ہیں جس کے نتیجے میں خوراک کے طور پر پیدا ہونے والی اشیاء بھی مہنگی ہوتی جارہی ہیں۔ یہ یاد رہے کہ جب عالمی تجارتی ادارہ (ڈبلیو ٹی او) کے معاہدوں پر مزاکرات ہورہے تھے تو یہ یقین دہانی کرائی جاتی تھی کہ زرعی معاہدے کی وجہ سے غریب ممالک کو زراعتی تجارت سے فائدہ پہنچے گا کیونکہ دنیا بھر میں درآمدی ٹیکس (ٹیرفس) کم کردیے جائیں گے۔

اس کتاب میں درج تحقیقات ۷ ایشیائی ممالک میں کی گئی ہیں۔ ان ممالک میں پاکستان، ہندوستان، ملیشیاء، انڈونیشیاء، تھائی لینڈ، فلپائن اور کوریا شامل ہیں۔ تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی دنیا کی غذا برآمد کرنے والے ملکوں نے اپنے درآمدی ٹیکس اور زراعت پر مراعات کا خاتمہ نہیں کیا اور اس کے ساتھ ساتھ تیسری دنیا کے ممالک میں سستی غذائی اشیاء کی تجارت کا ایک سیلاب جاری کردیا ہے۔ اس عمل کے باعث چھوٹے پیمانے کے کاشتکار کی آمدنی کم سے کم ہوتی جارہی ہے اور وہ قرضوں کے بوجھ تلے دبا جارہا ہے۔ جس کی وجہ سے آخرکار وہ اپنی زمین بیچنے پر مجبور ہے۔

فلپائن میں کی گئی تحقیق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حکومت آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور ڈبلیو ٹی او کی پالیسیوں کے تحت نقد آور فصلوں کی کاشت پر زور دیتی ہے، جس کی وجہ سے پیداواری لاگت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا براہ راست اثر کسان عورت اور مزدور پر پڑتا ہے مثلاً آزاد تجارت کے زمانے میں مزدور عورتوں کی اجرت کم سے کم ہوتی جارہی ہے۔ اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے وہ پہلے سے کئی گھنٹے زیادہ کام کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ مشاہدے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں میں بے روزگاری بڑھتی چلی جارہی ہے۔ ۱۵-۱۹ سال کی خواتین کی بے روزگاری کی شرح میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے مثلاً ۱۹۹۷ میں یہ شرح ۱۵ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۹۸ میں ۱۹ء۴ ہوگئی۔

کوریا کی زراعت سے متعلقہ مزدور عورتیں بھی اسی طرح کی چکی میں پس رہی ہیں۔ وہ بھی اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے زراعت کے علاوہ کئی دوسرے کام کرنے پر مجبور ہوتی جارہی ہیں۔ کوریا کی خاص غذا چاول ہے لیکن کوریا میں چھوٹے کاشتکار چاول سے ہٹ کر پھل اور سبزیوں کی کاشت کی طرف مائل ہورہے ہیں، کیونکہ چاول کی درآمد بڑھنے کی وجہ سے وہ منڈی میں مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ اس طرح سے

دیہات کے لوگوں کی چاول تک رسائی کم ہوتی جا رہی ہے جس سے تحفظ خوراک بڑی حد تک متاثر ہو رہی ہے۔

ہندوستان میں کی گئی تحقیق سے بھی یہ پتا چلتا ہے کہ خوراک پر پیداواری اخراجات بڑھنے کی وجہ سے خوراک کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ آمدنی کم ہونے کی وجہ سے خوراک کے استعمال میں کمی واقع ہوئی ہے۔ جدید طرز زراعت کی وجہ سے عورتوں کی بے روزگاری اور قرضوں میں اضافہ اور سرکاری امداد میں کمی واقع ہوئی ہے۔ کئی ہزار کاشتکاروں نے اپنی زمین گروی رکھ دی ہے یا بیچنے پر مجبور ہیں۔

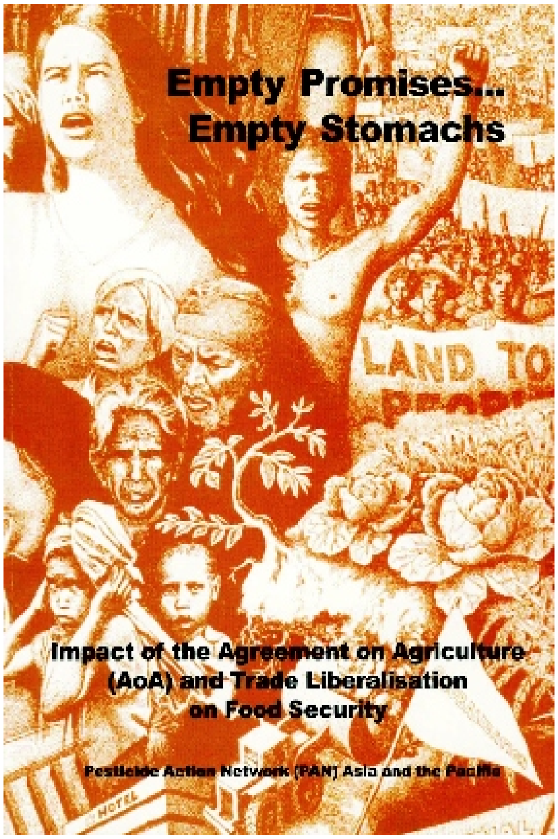

پاکستان کے برعکس فلپائن، ملیشیاء اور دیگر ممالک میں مزدور کسان عورتیں خود کیڑے مار ادویات فصلوں پر چھڑکتی ہیں۔ اس کتاب میں درج کی ہوئی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدید زراعت میں کیمیائی کھاد اور کیڑے مار دوا کے استعمال کی زیادتی کی وجہ سے عورتوں کی صحت پر سنگین اثرات پڑے ہیں۔

پاکستان کی طرح انڈونیشیاء میں بھی ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی مشروط معاشی ترقیاتی اسکیم کو اپنایا گیا ہے، جس کی بنیاد آزاد تجارت کا فروغ ہے۔ حکومت نے ڈبلیو ٹی او کے زراعتی معاہدے کو بھی سرکاری پالیسی کا حصہ بنایا ہے جس کے نتیجے میں خوراک پر درآمدی ٹیکس کم کر دیے گئے۔ لیکن دوسری طرف نجکاری کی پالیسی کے تحت زرعی پیداوار میں استعمال ہونے والی اشیاء مثلاً کھاد، دوا وغیرہ سب کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ مراعات کا خاتمہ کیا گیا نتیجتاً چاول، مکئی، مونگ پھلی اور آلو کی کاشت کم ہوگئی ہے۔ اجرت میں کمی اور بے روزگاری کی وجہ سے غربت بڑھ رہی ہے۔ اس بگڑتی ہوئی صورتحال کی وجہ سے چھوٹے کاشتکار کے بچاؤ کے لیے قرضہ جات کی اسکیمیں پیش کی گئیں، لیکن یہ اسکیمیں مردوں کے حوالے سے بنائی جاتی ہیں، اس طرح خواتین کو ان اسکیموں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا لیکن ہر صورت میں آزاد تجارت کے نقصانات سے پوری طرح ''فیضیاب'' ہوتی ہیں۔

پاکستان میں کی گئی تحقیق سرکار کی نجکاری کی پالیسیوں پر تفصیلاً روشنی ڈالتی ہے اور ان پالیسیوں کے تحت چھوٹے کاشتکار اور مزدور عورتوں کے حالات کو واضح کرتی ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی پالیسیوں کے تحت پاکستان نے ۱۹۸۸ میں بجلی کی نجکاری کا فیصلہ کیا تھا۔ ڈیزل کی قیمت میں بھی اضافہ ان ہی اداروں کی آمرانہ پالیسیوں کے وجہ سے کیا گیا، نتیجہ یہ ہے کہ صرف ۱۹۹۸-۲۰۰۰ کے دورانیہ میں ٹریکٹر کے فی ایکڑ اخراجات میں ۵۸ فیصد اضافہ ہوا۔ اسی دورانیے میں ٹیوب ویل کا خرچہ ۴۵ فیصد بڑھا ہے اس کے علاوہ نقد آور اور برآمدی فصلوں کی کاشت پر سرکار کی بڑھتی ہوئی توجہ کی وجہ سے غذائی فصلوں کی کاشت کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ تحقیق بتاتی ہے کہ ان پالیسیوں کی وجہ سے دیہاتی گھرانوں کی خوراک تک رسائی گھٹتی جا رہی ہے۔

کتاب ''خالی وعدے... خالی پیٹ: زراعت کے عالمی معاہدے اور آزاد تجارت کے تحفظ خوراک پر اثر'' میں دنیا بھر میں ہونے والے احتجاجات کے بارے میں کچھ تفصیلات درج ہیں۔ تحفظ خوراک دنیا بھر کی غریب عوام کے لیے ایک سنگین مسئلہ بن چکا ہے اس مسئلے کے حل کے لیے مطالبات پیش کیے گئے ہیں۔

ایشیائی ممالک کی مشاورتی کانفرنس جو کہ اگست ۲۰۰۱ میں تھائی لینڈ میں منعقد ہوئی، وہاں پر کئی ملکوں سے آئی ہوئی تنظیموں نے یہ مطالبہ کیا کہ خوراک تک رسائی ایک بنیادی انسانی حق ہے اور ایسے قوانین بنانے کی ضرورت ہے جو اس حق کو مکمل طور پر تکمیل تک پہنچائے۔ کسانوں اور مزدوروں کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنی خوراک، روزگار اور طرز زندگی کے بارے میں خود فیصلے کر سکیں۔ زمین کے حوالے سے زرعی اصلاحات کیے جائیں تاکہ ہاری اور چھوٹے پیمانے کے کاشتکاروں کو زمین مل

سکے۔ان اصلاحات کو پائے تکمیل تک پہنچائے بغیر تحفظ خوراک ممکن نہیں ہے۔

اس بات پر باہمی اتفاق بڑھ رہا ہے کہ دنیا بھر سے بھوک مٹانے کی طرف کوئی مثبت اور عملی قدم اس وقت تک نہیں اٹھایا جاسکتا جب تک زراعتی معاہدے کو ڈبلیو ٹی او سے باہر نہ کر دیا جائے۔گزشتہ سال تھائی لینڈ میں کسانوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں اس بات پر سخت احتجاج ہوا کہ زراعت، جو کہ زندگی کی بنیادی ضرورت یعنی خوراک فراہم کرتی ہے، آزاد تجارت کے بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے اور یہ نعرہ لگایا گیا کہ: ''عالمی بھوک ختم کرو''، ''زراعت کو ڈبلیو ٹی او سے باہر کرو'' اسی طرح کے کئی جلسے اور کانفرنس ملیشیاء کے شہر کولالمپور (۱۹۹۸)، امریکہ کے شہر سیاٹل (۱۹۹۹)، ہندوستان کے صوبے تامل ناڈو میں (۲۰۰۰) میں منعقد کیے گئے ہیں۔

یہ مطالبہ شدت کے ساتھ بڑھ رہا ہے کہ جینیاتی اجزاء میں تبدیلی کے بعد نئی طرز کی بیج اور فصلوں کی کاشت پر مکمل پابندی لگا دی جائے۔اس مطالبہ کی بنیاد عالمی زرعی کمپنیوں کے عوام دشمن منصوبے ہیں جن کے تحت وہ بیج پر ذہنی ملکیت دائر کر رہے ہیں۔اس طرح بیج بچانے اور ان کو اگلی فصل میں کاشت کرنے کا حق کسانوں کے پاس نہیں رہے گا۔سرمایہ دارانہ طرز کاشتکاری دنیا بھر کی زراعت پر حاوی ہو جائے گا۔جس کے باعث دنیا بھر کی خوراک کی پیداوار اور کاروبار پر کمپنیوں کا مکمل اختیار ہو جائے گا نتیجتاً عالمی سطح پر بھوک کا یقینی بڑھنا ہے۔

انہی وجوہات کی بنا پر جینیاتی بیجوں کی پیداوار اور کاشت کے خلاف غم و غصہ نہ صرف کسان برادری میں پایا جاتا ہے بلکہ سائنس دانوں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کی طرف سے بھی سخت احتجاج ہو رہا ہے۔جینیاتی بیج کے تحفظ کے لیے ڈبلیو ٹی او میں ایک اور معاہدہ بنایا گیا ہے جو معاہدہ برائے تحفظ ذہنی ملکیت (ٹرپس) کہلاتا ہے۔ مطالبات کی فہرست میں سے ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ ٹرپس کو ختم کیا جائے اور خاص طور پر زندہ اجناس پر ذہنی ملکیت جیسے معاہدے لاگو نہ کیے جائیں۔

پائیدار ترقی کی جانب منفی اقدامات!

ولی حیدر

اس سال اگست میں جنوبی افریقہ کے شہر جوہانس برگ کے مقام پر عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی (ڈبلیو ایس ایس ڈی) کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔اس کانفرنس کا مقصد پائیدار ترقی کو درپیش چیلنجوں کا احاطہ کرنا ہے۔۱۹۹۲ میں ریو، برازیل کے مقام پر اقوام متحدہ کے زیر اہتمام پائیدار ترقی کے موضوع پر ایک سربراہ کانفرنس منعقد کی گئی تھی، جس میں دنیا کے لیے پائیدار ترقی کی اصطلاح از سر نو مرتب کی گئی۔ریو کانفرنس میں مختلف معاہدے اور پائیدار ترقی کے لیے اقدامات کی نشاندہی کی گئی۔جوہانس برگ میں ریو کانفرنس میں کیے گئے اقدامات کا جائزہ لیا جائے گا اور مستقبل کے لیے حکمت عملی مرتب کی جائے۔

ڈبلیو ایس ایس ڈی کے حوالے سے ہر ملک میں مشاورتی اجلاس منعقد کیے جا رہے ہیں تاکہ عوامی مسائل حکومت کے تیار کردہ مسودے میں شامل کر کے ڈبلیو ایس ایس ڈی تک پہنچائے جا سکے۔مستقبل کے بارے میں فیصلے کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ریو کانفرنس کے انعقاد اور اس میں ہونے والے فیصلوں اور اس ضمن میں ہونے والے اقدامات پر ایک نظر ڈالی جائے۔

۱۹۷۰ کی دہائی کے بعد اس تنقید میں اضافہ ہوا کہ سرمایہ دارانہ ترقی کے باعث انسانوں کا اپنا وجود اور کرۂ ارض، دونوں ہی خطرے سے دوچار ہیں۔۱۹۸۲ میں عالمی کمیشن برائے ماحولیات اور ترقی نے بھی اس کی نشاندہی کی کہ جتنی تیزی سے دنیا میں پیداوار بڑھ رہی ہے اتنی ہی تیزی سے دنیا میں بھوک و افلاس میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے وابستہ ۳۰ فیصد آبادی دنیا کے ۷۰ فیصد وسائل کا استعمال کرتی ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک کی ۷۰ فیصد آبادی کے پاس صرف ۳۰ فیصد وسائل موجود ہیں۔ان وجوہات کی بناء پر ترقی کو ہی چیلنج کیا گیا ہے اور ایسی منصوبہ بندی اور ماڈل کی ضرورت محسوس کی گئی جس میں بحیثیت مجموعی انسانی اور ماحولیاتی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھا گیا ہو۔ان ہی وجوہات کی بناء پر روایتی ترقی کے بجائے پائیدار ترقی کا تصور ابھر کر سامنے آیا۔پائیدار ترقی کا ایک باضابطہ تعارف برانڈٹ رپورٹ ۱۹۸۰ میں پیش کیا گیا ''ایسی ترقی جو حال کے ضروریات سے اس طرح عہدہ برآں ہو کہ اس سے آئندہ آنے والی نسلوں کی ضروریات کی صلاحیت متاثر نہ ہونے پائے'' اس تعریف سے چند اہم نکات سامنے آتے ہیں۔

ماحولیات، معاشرے اور معیشت کے درمیان تعلق پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ اب تک ہونے والی ترقی کی بنیاد نہ صرف مستقبل سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ عوامی اور ماحولیاتی لحاظ سے بھی موثر ثابت نہیں ہوئی ہے۔ اگر سرمایہ دارانہ ترقی کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ترقی کا بنیادی مقصد کاروبار کی ترقی کی بنیاد پر منافع کا حصول ہے۔ آج سرمایہ دارانہ نظام پر دو حوالوں سے خاص طور پر تنقید ہو رہی ہے اول غربت میں بڑھتا ہوا اضافہ اور دوئم ماحولیاتی مسائل کی وجہ سے کرہ ارض کا انسان سمیت دیگر جانداروں کی زندہ رہنے کے لیے تنگ ہوتا ہوا دامن ہے۔ سرمایہ دارانہ ترقی کے صنعتی اور زرعی انقلابات کے باعث ایک طرف عوام کے بجائے ایک مختصر طبقے کا اقتدار مضبوط ہوا تو دوسری طرف ماحولیاتی آلودگی میں اس قدر اضافہ ہوا کہ ۱۹۸۰ کی دہائی میں یہ تنقید علمی حلقوں کا دائرہ توڑتے ہوئے عوام الناس کے دائرے میں داخل ہوئی۔ اس تنقید کی بنیاد پر ریو کانفرنس میں ایک حکمت عملی کا مسودہ تیار کیا گیا جسے ایجنڈا ۲۱ کا نام دیا گیا ہے۔ اس ایجنڈے میں تین اہم موضوعات کی نشاندہی کی گئی ہے:

۱۔ معاشی اور سماجی حوالے سے چند اہم نکات پر زور دیا گیا: مثلاً غربت کا خاتمہ، امیر اور غریب ممالک میں اشیاء کے استعمال میں توازن، صحت کی حفاظت اور بہتری، انسانی رہائش کے لیے صاف اور محفوظ آبادیاں وغیرہ۔

۲۔ ماحولیاتی وسائل کا تحفظ اور صحیح استعمال: مثلاً جنگلات کا تحفظ، کرہ ارض کی پائیدار حفاظت اور انتظام، پائیدار زرعی اور دیہی ترقی، تحفظ حیاتیات، خطرناک فضلات اور زہریلی کیمیائی اجزاء کا محفوظ انتظام اور استعمال وغیرہ۔

۳۔ کرہ ارض کے مختلف گروہوں کی پائیدار ترقی پر بھی زور دیا گیا جن میں عورتیں، بچے، قدیم مقامی باشندے، مزدور اور کسان شامل ہیں۔

ان تین اہم موضوعات کی نشاندہی کے علاوہ کانفرنس کے دوران دو انتہائی اہم کنونشن اقوام متحدہ میں شامل کیے گئے جو

۱۔ کنونشن برائے موسمیاتی تبدیلی

۲۔ کنونشن برائے حیاتیاتی پھیلاؤ (بائیوڈیورسٹی) کہلاتے ہیں۔

ڈبلیو ایس ایس ڈی کے انعقاد کا بنیادی مقصد ریو کانفرنس کے بعد سے لیکر اب تک پچھلے دس سالوں کے درمیان کیے گئے اقدامات اور عالمی ماحولیاتی صورتحال کا جائزہ ہے جو کہ مختلف ملکوں اور اداروں نے پائیدار ترقی کے حوالے سے کیے ہیں، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس بات کو پرکھا جائے کہ پائیدار ترقی کے ضمن میں دیے گئے اقدامات کی طرف پیش قدمی کس رفتار سے ہو رہی ہے؟ اور یہ کہ آج انسان کو بھوک و افلاس اور ماحولیاتی مسائل سے نمٹنے میں کس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے اور مستقبل میں ان مسائل سے نمٹنے میں کامیابی کے امکانات کتنے ہیں؟

وہ تمام حقائق جن کا عالمی کمیشن برائے ماحولیات اور ترقی ۱۹۸۰ نے جامع رپورٹ میں نشاندہی کی تھی مثلاً ملکوں کے درمیان، معاشی آزادی، ماحولیاتی آزادی، ممالک کے درمیان مقامی وسائل پر انحصار اور ان کا درست استعمال وغیرہ جیسے اہم نکات آج ۲۰ سال بعد بھی بالکل اسی طرح سے نظر آ رہے ہیں۔

۱۹۹۲ میں ہونے والی پائیدار ترقی کی کانفرنس میں بھی پائیدار ترقی کے لیے ان ہی اصولوں کے عملدرآمد پر زور دیا گیا تھا اور ایسی پالیسیوں کو مرتب کرنے کا خیال پیش کیا گیا تھا کہ جس سے ملکوں کی معیشت مستحکم ہو کیونکہ جب تک کسی ملک کی

گلوبلائزیشن اور عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی:

اس سال اگست میں جنوبی افریقہ کے شہر جوہانس برگ میں عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی (ڈبلیو ایس ایس ڈی) منعقد ہونے والی ہے۔ اس کانفرنس سے قبل دنیا کے صنعتی طور پر ترقی یافتہ آٹھ ممالک کی تنظیم جی-۸ کے وزراء کی پہلی کانفرنس جون ۲۶ اور ۲۷ کو منعقد ہوگی۔ ان دو اجلاسوں کی تیاری کے سلسلے میں جی-۸ کے ممالک کا ایک اجلاس کینیڈا میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی خفیہ کارروائی میں زیر غور آنے والے مسودے کی ایک نقل کونسل آف کینیڈینز نامی تنظیم نے جاری کی ہے جو جی-۸ ممالک کے وزراء برائے ماحولیات کی طرف سے عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی کے بارے میں ان کے موقف پر مبنی تجاویز پر مشتمل ہے۔ اس مسودہ سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح صنعتی ممالک کے وزرائے ماحولیات، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے بڑی بڑی کارپوریشنوں کے مفادات کا تحفظ کرنے والا ایجنڈا، عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی کے اجلاس کے موقع پر دنیا بھر کے ممالک پر تھوپا جائے گا۔

پورے مسودہ میں پائیدار ترقی کو گلوبلائزیشن سے جوڑنے کی ضرورت پر توجہ مرکوز کی گئی ہے مثلاً مسودہ میں لکھا ہے "یہ (کانفرنس) نیویارک میں (اقوام متحدہ کے زیر اہتمام) ہزاری اجلاس، دوہا میں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے تحت بات چیت اور مالیات برائے ترقی کانفرنس، مونٹرے کے دوران حاصل ہونے والے مثبت نتائج کے ملاپ کا نقطہ ہونا چاہیے" اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دی کونسل آف کینیڈینز کے چیئرمین نے کہا "یہ دیکھ کر انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ جی-۸ کے وزراء برائے ماحولیات دنیا کی ماحولیات کو کارپوریٹ گلوبلائزیشن کے ماتحت لانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ دنیا کا ماحولیاتی بحران شدید ہوتا جا رہا ہے۔ جس بات کا وہ عہد کرنے جا رہے ہیں وہ اسی گلوبلائزیشن کا پھیلاؤ ہے جو ماحولیاتی بحران کی وجہ ہے۔"

ایک اور عہدے دار نے کہا "ہر دفعہ تجارتی معاہدوں کے مواقع پر ماحولیات کے مسئلہ کو زیر غور لایا جاتا ہے لیکن ماحول تباہ ہو رہا ہے۔ یہ کرہ ارض کے مستقبل کیلئے بہت برا شگون ہے۔ جی-۸ کے ممالک، یہ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح ماحول کو تحفظ دینے کی حکومتی قوت کو محدود کرنا ہے۔ درحقیقت جی-۸، ڈبلیو ٹی او کے ایگزیکٹو کی حیثیت سے کام کرتا ہے اور جو واضح طور پر اس بات کو یقینی بنانا چاہتا ہے کہ ماحولیاتی معاملات کسی طرح کارپوریشنوں کے منافع جات کو محدود کرنے نہ پائے۔"

ڈبلیو ٹی او کے دوہا مذاکرات میں جی-۸ کامیابی کے ساتھ پانی اور ماحولیات کی خدمات کو ازسرنو تبدیل کرنے اور کارپوریشنوں کے کنٹرول میں لانے پر زور دیتے رہے ہیں۔

کانسل آف کینیڈین پریس ریلیز: جی-۸ اینوائرمنٹ منسٹرز سیل آؤٹ ٹو گلوبل ٹریڈ ایجنڈا، ۱۲، اپریل ۲۰۰۲،
ڈیبیٹ لسٹ سروو (debate@sunsite.wits.ac.za)

معیشت مستحکم نہیں ہوگی اس وقت تک وہاں پائیدار ترقی ممکن نہیں ہے۔ مگر آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملکوں کو اپنی مرضی کے مطابق معاشی پالیسیاں بنانے سے روکا جا رہا ہے۔ ریو کانفرنس کے تحت ایجنڈا ۲۱ میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ امیر ممالک، غریب ممالک کو اپنی پیداوار کا ۰ء۷ فیصد رقم ایجنڈا ۲۱ کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیے فراہم کریں گے۔ اس وعدے کی سراسر خلاف ورزی ہوتی رہی ہے اور اس وقت اس کی شرح ۰ء۲ فیصد ہے امریکہ اس وقت ۵۰ بلین ڈالرز فراہم کر رہا ہے جبکہ وعدہ ۱۷۵ بلین ڈالرز کا تھا۔ اس کے علاوہ ۲۰۰۲ میں مونٹرے، میکسیکو میں ہونے والی اقوام متحدہ کی کانفرنس مالیات برائے ترقی میں امریکہ نے واضح کر دیا کہ وہ اپنے ایجنڈا ۲۱ کے تحت مالیاتی مدد کا وعدہ برائے پائیدار ترقی اسی حال میں پورے کرنے پر غور کریگا جب تمام ممالک سرمایہ دارانہ آزاد تجارت کے اصولوں کو اپنانے پر پابند ہوں۔

اس کے علاوہ ۲۰۰۱ میں ہونے والی اقوام متحدہ کی کانفرنس برائے موسمیاتی تبدیلی میں امریکہ نے اس کنونشن (جو کہ ریو کانفرنس کا حصہ ہے) کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اب اپنے کیے ہوئے وعدوں سے پیچھے ہٹ رہا ہے۔ امریکہ کا خیال ہے کہ اگر وہ اپنے وعدے پورے کرتا ہے تو اس کی صنعت کو کئی بلین ڈالرز کا نقصان ہوگا اور ۵۰ لاکھ افراد بیروزگار ہو جائیں گے۔ اصل میں ماحولیات کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے ممالک صنعتی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ہیں مثلاً امریکہ دنیا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی کل مقدار کا ۳۳ فیصد اور یورپ ۲۰ فیصد فضا میں خارج کرتے ہیں، جو اوزون کے لیے سب سے زیادہ خطرناک گیس شمار کی جاتی ہے۔ دنیا کی یہ بڑی بڑی کمپنیاں ہی دن بہ دن بگڑتے ہوئے ماحولیاتی آلودگی کی ذمہ دار ہیں۔ بین الاقوامی کارپوریشنیں کس طرح ماحولیات اور اس کی روک تھام کرنے کی غرض سے منعقد کانفرنسوں پر اثر انداز اور انہیں سبوتاژ کرتی ہیں اس کا اندازہ ۱۹۹۷ کی جاپان میں ہونے والی کیوٹو کانفرنس کے موقع پر دیکھنے میں آیا جب کارپوریشنوں نے اس کانفرنس کے خلاف چلائی جانے والی اشتہاری مہم پر ۱۳ ملین ڈالرز خرچ کر ڈالے۔ امریکہ کی دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کے ہر ممبر کانگریس اور ورسینٹ کو فی کس ۵۰ ملین ڈالرز دیے گئے تاکہ وائٹ ہاؤس ان کے منصوبوں کا تحفظ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ نے کیوٹو کانفرنس میں کیے جانے والے وعدوں سے انحراف کیا ہے۔

ریو کانفرنس میں دوسرا اہم کنونشن برائے بائیوڈائیورسٹی (سی بی ڈی) ہر ملک کی حیاتیاتی اور جینیاتی وسائل پر حق خودارادیت کو ترجیح دیتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ان وسائل تک غیر ملکی کمپنیوں اور حکومتوں کی پہنچ سے پہلے اس ملک، جس میں وہ شئے پائی جاتی ہے، کے اعتراضات کو مدنظر رکھنا ضروری قرار دیتا ہے۔ سی بی ڈی مقامی لوگوں، کسانوں، بائیوڈائیورسٹی (حیاتیاتی پھیلاؤ یعنی وہ تمام زندہ اثاثہ جس میں انسان، جانور، پھل، پھول اور ان کا جینیاتی مواد شامل ہے) اور علم کی حفاظت اور مدد کی ضمانت دیتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ سی بی ڈی اس بات کو بھی یقینی بناتا ہے کہ مقامی علم اور وسائل کو استعمال میں لاتے ہوئے کاروبار سے جو بھی منافع حاصل ہو، اس کو مقامی لوگوں کے ساتھ برابری کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے۔ سی بی ڈی ملکوں کو اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے حیاتیاتی وسائل کو جیسے چاہے استعمال کریں (یہ امر قابل ذکر ہے کہ امریکہ نے اس کنونشن کی بھی تصدیق نہیں کی)۔ ڈبلیو ٹی او اپنے اندر ذہنی ملکیت کا معاہدہ (ٹرپس) سموئے ہوئے ہے جو سی بی ڈی میں دیے گئے حقوق کی مکمل نفی کرتا ہے۔ ذہنی ملکیت کے معاہدے اور یو پی او وی کنونشن ۱۹۹۱ کے باعث اب بائیوڈائیورسٹی سے حاصل کیے ہوئے اشیاء پر سے عوامی اختیارات بین الاقوامی کمپنیوں کو منتقل ہو گئے ہیں یعنی اگر کمپنیاں جینیاتی مواد کو دریافت کرتی ہیں تو اس پر اپنی ذہنی ملکیت کی چھاپ لگا سکتی ہیں اور اس طرح تیسری دنیا کے کسان اور وہ مقامی گروہ جو ہزاروں طرح کے پھل اور پودے دنیا کی غذائی ذخیرے میں جمع کرنے کے باعث بنے ہیں، اس حق سے محروم ہو گئے ہیں کہ اس مواد پر مزید اختیار برقرار رکھ سکیں یعنی پائیدار ترقی کا حصول کمپنیوں کو اختیارات دینے کے بعد ناممکن بنا دیا گیا ہے۔

ڈبلیو ٹی او کے قوانین ملکوں کو پابند کرتے ہیں کہ وہ آزاد تجارت یا گلوبلائزیشن کے لیے راہیں ہموار کریں۔ غیر ملکی کمپنیوں کا منڈی تک آسان رسائی اور ان کو مراعات فراہم کرنے کے لیے قوانین کے نفاذ کے لیے ملکی سطح پر مسلسل دباؤ ڈالا جاتا ہے حالانکہ یہ قوانین انسانی فلاح اور ماحولیات کے نقطہ نظر سے کسی طرح بھی پائیدار ترقی کے اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتے جبکہ دوسری طرف سی بی ڈی جیسے معاہدے جو اقوام متحدہ کے تحت بنائے جاتے ہیں، قانونی حیثیت نہیں رکھتے۔

آزاد تجارت اور پائیدار ترقی کو ایک دوسرے کی ضد کے طور پر دیکھا جاتا ہے کیونکہ آزاد تجارت کے پیچھے امریکہ یورپ، جاپان اور عالمی مالیاتی ادارے جیسی سامراجی طاقتیں کھڑی ہیں جن سے وابستہ بین الاقوامی کمپنیاں ہر قسم کی تنقید کے باوجود دنیا بھر میں غربت میں اضافے اور ماحولیاتی آلودگی بڑھانے پر بضد ہیں کیونکہ انسانی فلاح اور ماحولیاتی بہتری کی ہر کوشش ان کمپنیوں کے منافع میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔

آزاد تجارت کی پالیسیوں کے تحت کمپنیوں کو جو طاقت ملی ہے وہ ملکوں کو بے بس کرتی ہے اور کمپنیوں کے سرمایہ میں بے انتہا اضافہ کا باعث ہے۔ دنیا کی کئی کمپنیاں ایسی ہیں جن کی مصنوعات کی سالانہ فروخت کئی ملکوں کے سالانہ بجٹ سے زیادہ ہے۔ ان تمام کمپنیوں کا تعلق پہلی دنیا سے ہے۔ آزاد معیشت میں کمپنیوں کو ملکوں پر فوقیت دی جاتی ہے مثلاً فلپائن میں ہوئیکسٹ، جو کہ ایک بہت بڑی جرمن کیڑے مار ادویات تیار کرنے والی کمپنی ہے، تھائیوڈان نامی کیڑے مار دوا بناتی تھی جس کے باعث عورتوں کو کینسر لاحق ہو سکتا ہے۔ فلپائن کے ادویات کے ادارے نے اس پر دو سال کے لیے پابندی لگا دی، مگر ہوئیکسٹ نے مقامی عدالت سے اسی دوا کو بنانے کی اجازت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ بات یہیں تک محدود نہیں رہی فلپائن پیسٹی سائیڈ

ایکشن نیٹ ورک کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رومی کو ئیجانو، جنھوں نے ایک ورکشاپ کے دوران یہ کہا تھا کہ تھائیوڈان کا استعمال عورتوں میں کینسر کا باعث بن سکتا ہے، پر مقدمہ دائر کردیا۔

ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح بین الاقوامی کمپنیاں اپنے منافع کی خاطر ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگی اور ماحولیات سے کھیلتی ہیں اور اس راہ میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو کیسے عبور کرتی ہیں۔ ان کمپنیوں کی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کی ۸۰ فیصد زیر کاشت زمین بڑی کمپنیوں کی ملکیت ہے، جب کہ دنیا کی ۲۰ بڑی کمپنیاں ۹۰ فیصد کیڑے مارنے والی ادویات اور بیج کا کاروبار کرتی ہیں۔

ایک اور مثال ہالینڈ سے تعلق رکھنے والی کمپنی شیل کی ہے، یہ کمپنی نائیجریا میں ۱۹۵۸ سے تیل نکالنے میں مصروف ہے اور اپنی مجموعی پیداوار کا ۱۴ فیصد تیل یہیں سے حاصل کرتی ہے۔ نائیجریا میں شیل کی پائپ لائین سطح زمین سے اوپر بچھی ہوئی ہے یہ لائینیں گاؤں اور زیر کاشت زمین سے ہوکر گزرتی ہیں۔ گیس کی وجہ سے لوگوں کی صحت مستقل متاثر ہورہی ہے اور لوگ اپنے کھیتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، جس کے نتیجے میں نائیجریا میں غربت کی شرح افریقہ کی مجموعی شرح سے بھی زیادہ ہے۔ ان حالات میں نوجوانوں کی بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں شہروں کا رخ کررہے ہیں۔ مقامی لوگوں نے ماحول اور معاشرے پر منفی اثرات کے جرمانے کے طور پر کمپنی سے ۱۰ ملین ڈالر ہرجانے اور پائپ لائن کو زیر زمین بچھانے کا مطالبہ کیا۔ شیل اور مقامی آبادی کے درمیان تنازعہ تصادم کی صورت اختیار کرگیا۔ ۱۹۹۰ میں پولیس نے ۸۰ غیر مسلح دیہاتیوں کو ان کے لیڈر سمیت گرفتار کرلیا۔ جب کمپنی نے انتظامیہ سے مدد کی درخواست کی تو نائیجریا کی عدالت نے شیل کی سرگرمیوں پر تنقید کی اور کہا کہ شیل، تیل کی فروخت سے جو منافع کماتی ہے اس کا زیادہ تر حصہ ان لوگوں کو ملنا چاہیے جن سے زمین لی گئی ہے۔ شیل کے خلاف ۱۹۹۳ میں تقریباً ایک لاکھ لوگوں نے مظاہرہ کیا اور مطالبہ کیا کہ شیل انکے مطالبات تسلیم کرے جس کے نتیجہ میں نائیجریا کی آرمی طلب کی گئی اور مظاہرین کو منتشر کیا گیا۔

یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ آزاد تجارت کی پالیسیاں اور ڈبلیو ٹی او کے معاہدے عام لوگوں کے بجائے بڑی بڑی کمپنیوں کے مفاد میں ہیں، دوسرے الفاظ میں یہ ادارے اور ان کی پالیسیاں کمپنیوں کو مزید تقویت بخشنے کے ساتھ ساتھ قانونی جواز فراہم کرتی ہیں تاکہ ان کمپنیوں پر کسی قسم کی گرفت نہ ہوسکے۔ اوپر بیان کی گئی مثالیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ حکومتوں کو کس حد تک کمپنیوں کے مفاد کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ قطع نظر اس کہ اس سے کسی ملک کی مقامی آبادی مضر ترین آب و ہوا میں رہیں یا اس ملک کی مقامی صنعت تباہ ہو، حکومتیں پابند ہیں کہ آزاد تجارت کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو اپنی تمام تر طاقت کے ساتھ دور کریں۔ ایک طرف آزاد تجارت کی پالیسیاں ہیں جو کہ دنیا میں ماحول اور پائیدار ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں تو دوسری طرف پائیدار ترقی کے لیے معاشی بہبود کو ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ کیا یہ تضاد خود پائیدار ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے؟ کیونکہ کوئی بھی سرمایہ دار ایسا عمل کیوں کر کرسکتا ہے جس سے اس کا منافع کم ہوا، مثال کے طور پر کیا شیل اپنا کام نائیجریا میں بند کرسکتی ہے؟ جہاں سے یہ اپنی مجموعی پیداوار کا ۱۴ فیصد تیل حاصل کرتی ہے یا پھر تھائیوڈان جیسی مضر صحت کیڑے مار ادویات بنانے والی کمپنی ہوئیکسٹ اپنا کام بند کردے گی کہ ان کی مصنوعات کے باعث دنیا کے ماحول میں منفی اثرات مرتب ہورہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے تمام مسائل کی طرح پائیدار ترقی کے حصول کی جدوجہد کے بارے میں بھی کئی نقطہ نظر پائے جاتے ہیں جن میں سے اہم ترین درج ذیل ہیں:

- موجودہ ترقی کی سمت اس صورت میں درست ہوسکتی ہے جب اس میں انسانی ضروریات اور ماحول کو اولیت دی جائے۔ ان خیالات کے پرچار کرنے والے اداروں میں اقوام متحدہ اور ورلڈ بینک جیسے ادارے شامل ہیں۔ لیکن ورلڈ بینک اس کے ساتھ اس بات کی بھی وکالت کرتا ہے کہ عالمی ترقی کے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے آزاد تجارت کا راستہ اپنایا جائے، حکومتی کنٹرول کا خاتمہ کیا جائے اور بین الاقوامی اداروں کو کاروبار کرنے کی کھلی چھوٹ دی جائے ان اداروں کا استدلال ہے کہ عالمی غربت کے خاتمے کی طرف ایک قدم کے طور پر خوراک کے لیے وضع کردہ جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ دنیا بھر کا حکمران طبقہ ان خیالات کا حامل ہے جو سمجھتے ہیں کہ گلوبلائزیشن ایک ناگزیر عمل ہے اور اس سے نمٹنے کے لیے ہر ملک کو آزاد تجارتی اصولوں کے تحت تیاری کرنی چاہیے۔

- گلوبلائزیشن مخالف تحریک میں شامل ایک بڑے حلقے کا خیال ہے کہ دنیا میں غربت اور ماحولیاتی مسائل کی ایک اہم وجہ آزاد تجارت کا جدید نظام ہے۔ اس مکتبہ فکر کے نزدیک اس کی ابتداء آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے انتظامی ڈھانچے کے پروگرام (سیپ) سے ہوئی اور آزاد تجارت کے مزید مستحکم کرنے کی خاطر ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن قائم کیا گیا ہے۔ یہ تمام ادارے حکومتی کنٹرول کا خاتمہ کرکے اس کی جگہ ڈبلیو ٹی او کی آزاد تجارتی اصولوں کا عالمی سطح پر نفاذ چاہتے ہیں۔ گلوبلائزیشن مخالف تحریک میں شامل اکثر بین الاقوامی تسلط کے بجائے حکومتی کنٹرول کو ترجیح دیتے ہیں۔ البتہ ان میں سے اکثر گلوبلائزیشن کے پھیلاؤ کو ناگزیر بھی سمجھتے ہیں۔ اس تحریک سے وابستہ گروہ ہیں ایسی پالیسیوں کو ترجیح دیتے ہیں جن سے ان کے مفادات کی حفاظت ہوتی رہے۔ اس میں زیادہ تر وہ طبقہ شامل ہے جو تیسری دنیا میں آسائش کی زندگی بسر کررہا ہے۔ اسی گروپ میں وہ گروہ بھی شامل ہیں جو صنعتی انقلاب سے اب تک ہونے والی ترقی کے خلاف ہیں اور یہ خاص طور پر تیسری دنیا کے لیے ترقی کے موجودہ منصوبوں اور آزاد تجارت کو ایک نئے نوآبادیاتی نظام کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہ روایتی کھیتی باڑی اور سابقہ جاگیرداری نظام کو بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ہونے والی تقریباً تمام

ہی ترقی کو رد کرتے ہیں۔گلوبلائزیشن مخالف تحریک میں اکثریت کا تعلق اصلاح پسند گروہوں سے ہے۔

-انقلابی خیالات رکھنے والے گروہ کا خیال ہے کہ غربت اور ماحولیات کا مسئلہ اس لیے موجود ہے کیونکہ سماج طبقات میں بٹا ہوا ہے۔اگر منصوبہ بندی اور ترقی کی بنیاد حکمران طبقہ کے مفادات کے برعکس معاشرے کے ایک عام فرد کی خواہشات کے مطابق رکھی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ غربت اور ماحولیاتی مسائل پر قابو نہ پایا جا سکے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ ترقی کی بنیاد سرمایہ دارانہ مفادات ہیں، جن کا مطمع نظر صرف منافع کا حصول ہے۔اپنی حکمرانی اور مراعات کے مفادات کے لیے وہ کروڑوں عوام اور کرہ ارض کی تباہی کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔اگر عوامی مفادات کو پیش نظر رکھا جائے تو سائنسی ترقی کو استعمال کرتے ہوئے دنیا سے بھوک و افلاس اور ماحولیاتی بگاڑ کا خاتمہ ممکن ہے۔یہ مکتبہ فکر ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور ڈبلیو ٹی او کے خاتمے کو ہی کافی نہیں سمجھتے بلکہ استحصالی نظام کے مکمل خاتمے کی بات کرتے ہیں۔

تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ جو تنقید اب تک ہونے والی ترقی پر کی گئی، عالمی مالیاتی اداروں نے انہیں ترک کرنے کے بجائے انہی منصوبوں کو نئے ناموں مثلاً غربت میں کمی اور پائیدار ترقی کے نام سے متعارف کرانا شروع کر دیا ہے۔۱۹۵۰ کے بعد دنیا میں ترقی کا سب سے بڑا دعویدار ورلڈ بینک رہا ہے اور اس کی پالیسیاں سب سے زیادہ تنقید کی زد میں آئی ہیں۔شائد اسی لیے سب سے پہلے ورلڈ بینک کے موجودہ صدر نے تنقید میں کمی کی خاطر غربت میں کمی کو اپنا نعرہ بنایا ہے۔دوسرے اداروں نے اس کی تقلید کی مثلاً ایشیائی ترقیاتی بینک نے غربت میں کمی اور ماحولیاتی تحفظ کے ساتھ ایسی معاشی ترقی پالیسی اپنائی ہے جو ''غریبوں کی حمایت'' اور ''پائیدار ترقی'' کی طرف جھکاؤ رکھتی ہو۔

پائیدار ترقی اور ترقی برائے آزاد تجارت یعنی گلوبلائزیشن کا سب سے بڑا تضاد یہی ہے کہ پائیدار ترقی ماحولیات، موجودہ اور مستقبل میں آنے والی نسلوں کی تحفظ اور مساوات کو ساتھ لے کر چلتی ہے جب کہ آزاد تجارت صرف معاشی ترقی اور منافع کو اپنا محور بناتی ہے، یقیناً دونوں کا امتزاج ناممکن ہے۔

۱۹۹۲ کی ریو کانفرنس کے بعد اہم کانفرنسیں

- ۱۹۹۷ میں ریو +۵، کے نام سے منعقد ہونے والی کانفرنس میں ایجنڈا ۲۱ پر مزید تبصرہ ہوا غربت کا خاتمہ امیر و غریب ممالک میں اشیاء کے استعمال میں توازن کے علاوہ جو موضوعات پر خاص طور پر زیر بحث آئے ان میں ماحولیات اور تجارت شامل ہیں۔
- اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ۵۵ ویں سیشن میں کانفرنس برائے ماحولیات اور ترقی (ریو کانفرنس) کے جائزے کے لیے عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی (ریو+۱۰ یا ڈبلیو ایس ایس ڈی) کو، ستمبر ۲۰۰۲ء، جنوبی افریقہ کے شہر جوہانس برگ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ڈبلیو ایس ایس ڈی ان موضوعات کا جائزہ لے گی جو ایجنڈا ۲۱ کو مکمل طور پر نافذ کرنے کے لیے ضروری ہیں۔
- ڈبلیو ایس ایس ڈی کی تیاری کی خاطر دنیا کے مختلف خطوں میں جون تا اکتوبر ۲۰۰۱ء اجلاس منعقد کیے گئے۔ان اجلاسوں میں مختلف خطوں کے ممالک کے نمائندے شریک ہوئے۔
- ڈبلیو ایس ایس ڈی کی تیاری کے سلسلے کا دوسرا اجلاس اس سال نیویارک میں ۲۸ جنوری تا ۸ فروری منعقد ہوا۔اس اجلاس میں مختلف گروہوں سے وابستہ تیار کردہ مسودے پر بات چیت ہوئی۔
- ڈبلیو ایس ایس ڈی کی تیاری کے سلسلے کا تیسرا اجلاس اس سال نیویارک میں ۲۵ مارچ تا ۵ اپریل، منعقد ہوا۔اس اجلاس میں کمیشن برائے پائیدار ترقی کے پہلے مسودے پر کام ہوا۔
- ڈبلیو ایس ایس ڈی کی تیاری کے سلسلے کا چوتھا اجلاس اس سال انڈونیشیاء میں ۲۷ مئی تا ۷ جون منعقد ہوگا۔اس اجلاس میں ڈبلیو ایس ایس ڈی میں پیش کیے جانے والے مسودے میں موجود مسائل پر تبادلہ خیال ہوگا۔
- ہر ملک میں پائیدار ترقی کے حصول کے لیے ایک ایسے مسودے کی تیاری ہو رہی ہے جو اس کی عوام اور حکومت کو درپیش ان معاشی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کی نشاندہی کرے جو اس مقصد کے حصول میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔پاکستان میں قومی سطح پر مشاورتی اجلاس مئی میں اسلام آباد میں آئی یو سی این کے تعاون سے منعقد ہونے والا ہے۔
- دنیا میں منعقد ہونے والی عوامی مشاورت سے یہ بات سامنے آرہی ہے کہ گلوبلائزیشن اور اس سے جڑی ہوئی جدید آزاد تجارت، پائیدار ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

حوالہ جات:

اس مضمون کی تیاری میں دی نیوز اور ڈان، کراچی، مختلف ویب سائٹ اور درج ذیل کتابوں اور رپورٹ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۱۔ جیڈ گریٹز اور کینی برونو، گرین واش: دی ریالٹی بی ہائینڈ کارپوریٹ اینوائر منٹلزم، آئی بون فاؤنڈیشن، تھرڈ ورلڈ نیٹ ورک ۱۹۹۸ء ۲۔ مینا ویلکی (ایڈیٹر) فنش ایکشن فارسٹین ایبل ڈیولپمنٹ: وزارت ماحولیات، فن لینڈ، ۱۹۹۵ء ۳۔ ایڈ واچ، اے پی آر این، کارپوریٹ پاور آر پیپلز پاور: ٹی این سیز اینڈ گلوبلائزیشن ۲۷-۲۹ دسمبر ۲۰۰۱ء، ورکشاپ پیپرز۔ ۴۔ گرو ہارلیم برانٹ لینڈ (چیئر مین) آور کامن فیوچر: دی ورلڈ کمیشن آن اینوائر منٹ اینڈ ڈیولپمنٹ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء

بات تو سچ ہے مگر......

کھاد پر جنرل سیلز ٹیکس دگنا کرنے کا امکان ہے:

حکومت نے مصنوعی کھاد پر بازاری سطح پر بھی جنرل سیلز ٹیکس کے نفاذ کا فیصلہ کیا ہے، جس سے جی ایس ٹی کی شرح دگنی ہو جائیگی۔

اس وقت حکومت کھاد کی درآمد اور ملک کے اندر تیاری پر ۱۵ فیصد ٹیکس کا نفاذ کرتی ہے جو کہ موجودہ مالی سال (۲۰۰۱۔۲۰۰۲) کے دوران لگایا گیا ہے۔ لیکن حکومت نے درآمد کنندگان اور کھاد تیار کرنے والے کارخانوں کو چھوٹ دے دی تھی جس کے تحت ان پر بازاری شرح سے ٹیکس نہیں لگایا تھا۔ اب حکومت نے فیصلہ کیا ہے کھاد پر بھی دیگر اشیاء کی طرح بازاری شرح کے لحاظ سے نافذ کرنے کے ساتھ کھاد ڈیلروں اور تقسیم کنندگان پر بھی جی ایس ٹی کا نفاذ کیا جائیگا۔ حکومت کے ان اقدامات سے کسان ہی متاثر ہوں گے کیونکہ فروخت سے قبل ہر مرحلے پر کسی بھی قسم کے ٹیکس کا نفاذ کیا جائے، اس کا بوجھ خریدنے والے کسان کو منتقل ہو جاتا ہے۔

(دی نیوز، کراچی، ۹، دسمبر ۲۰۰۱)

بیج پر تحقیق کے لیے کثیر رقم کی منظوری:

وفاقی وزیر زراعت نے کہا کہ حکومت نے بیج پر تحقیق کے ضمن میں ۱۰۰ ملین روپے کی منظوری دی ہے تاکہ مستقبل میں بہترین پیداوار حاصل کرنے کی خاطر عمدہ بیج تیار کیے جاسکے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ دنیا کے مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے ۱۸۰ افراد نے ایک معاہدہ پر دستخط کیے ہیں جس کے تحت ۲۰۰۴ کے بعد دنیا بھر کے ممالک بیج کی تجارت کیلئے اپنی منڈیوں کے دروازے کھولیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں اس صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلے کرنے چاہیے تاکہ ہم عالمی منڈی میں مقابلے کے قابل ہو سکیں۔

(ڈان، کراچی، ۱۱، جنوری ۲۰۰۲)

پاکستان میں جدید بیج کا استعمال ۶۰ کی دہائی کے دوران متعارف کیے گئے سبز انقلاب سے شروع ہوا۔ دراصل سبز انقلاب کی بنیاد ہی جدید بیج پر ہے، جس کے ساتھ ہی مصنوعی کھاد اور کیڑے مار ادویات کا استعمال بھی وابستہ ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مصنوعی بیج کو زیادہ پانی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس کے مقابلے میں مقامی اور صدیوں سے آزمودہ روایتی بیج کو پانی کی کمی اور مصنوعی کھاد کی ضرورت نہیں پڑتی اسکے علاوہ روایتی بیج کی ایک اور خوبی اسکا مقامی موسم اور ماحول سے ہم آہنگی ہے جو میکسیکو اور فلپائن میں امریکی اداروں کی تحقیق سے تیار کردہ بیجوں میں نہیں ہے۔ موجودہ حالات میں جب بارش اور پانی کی کمی کا شدید بحران پیدا ہوا ہے، ہمیں روایتی بیج کا استعمال کرنا چاہیے۔ لیکن حکومت کی منصوبہ بندی کرنے والوں کیلیے ایسا کرنا ممکن ہے کیونکہ بیج، مصنوعی کھاد اور کیڑے مار ادویات سے بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیوں اور مقامی سرمایہ داروں کے علاوہ حکومتی عہدیداران کا مفاد وابستہ ہے۔ حکومت کے وزیر اور مشیر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ملازم رہے ہیں جو حکومت میں بیٹھ کر ان اداروں کی نجکاری پر مبنی پالیسیاں نافذ کرواتے ہیں۔

حکومت کی اس تدبیر کی سخت مخالفت کی ضرورت ہے کیونکہ بیج سے خوراک الگ نہیں کی جاسکتی اور بیج پر حق ملکیت کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ آج دنیا میں ہزاروں طرح کی قدرتی بیج صدیوں کی کاشتکاری کے نتیجہ میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن بین الاقوامی کمپنیوں نے بیج کو منافع کمانے والی شئے میں تبدیل کردیا ہے اور اس کو نجی ملکیت کے دائرے میں لے آئے ہیں۔ اب دیگر اشیاء کی طرح بیج پر بھی حق ملکیت کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے خطے میں ہزاروں اقسام کی اجناس پائی جاتی ہیں، اگر ایک دفعہ حکومت بیج پر حق ملکیت تسلیم کرلیتی ہے تو عوام اور کاشتکار ایسے تمام اجناس سے ہاتھ دھو بیٹھے گی جن کو وہ ہزاروں سال سے کاشت کرتے آئے ہیں کیونکہ غیر ملکی کمپنیاں پہلے ہی ان سب کی جینیاتی مواد پر حق ملکیت دائر کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

چاول اور گنے کی کاشت پر پابندی:

ایک اطلاع کے مطابق آئندہ سال سے سندھ میں کپاس کی پیداوار دگنی ہو جائیگی کیونکہ صوبائی وزیر زراعت حسن علی چانہو کی ہدایت پر ''کپاس زیادہ اگاؤ'' کے نعرے کے تحت ''ایکشن پلان ۲۰۰۲'' کے نام سے سندھ کاٹن ڈیولپمنٹ پروجیکٹ کے تحت منصوبہ بندی کی گئی ہے۔

اس منصوبہ بندی پروگرام کے تحت سندھ کے کئی اضلاع میں چاول کی کاشت پر پابندی عائد کرکے چاول کی جگہ کپاس کی فصل کاشت کی جائیگی۔ منصوبہ کے تحت دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع تین اور بائیں کنارے پر واقع نو اضلاع پر توجہ مرکوز کی جائیگی۔ یہ سندھ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوگا کہ حکومتی دباؤ کے تحت ایسا کیا جائیگا۔ اس کی وجہ پانی کی کمی کو قرار دیا جارہا ہے۔ حکومت کے بقول ۱۹۹۹ میں کیے گئے سابقہ کامیاب تجربہ کی روشنی میں ایسے اقدامات کیے جارہے ہیں۔

۱۹۹۹ میں دریائے سندھ کے دائیں کنارے کے تین اضلاع شکارپور، لاڑکانہ اور جیکب آباد کے ۶۹۱ کاشتکاروں نے ۴۶۱۲ ہیکٹر رقبہ پر چاول کے بجائے

کپاس کاشت کی تھی۔ (دی نیوز، کراچی، ۱۱، نومبر ۲۰۰۱)

پانی کی کمی اور حکومتی پالیسی کی وجہ سے کسانوں پر دباؤ بڑھ رہا ہے کہ وہ نقد آور بازاری فصلیں اگائیں۔ چاول برصغیر کی قدیم ترین فصلوں میں سے ایک ہے اور صدیوں سے وادی سندھ میں کاشت ہو رہی ہے۔

چاول کی کاشت پر پابندی سے تحفظ خوراک کا مسئلہ سنگین تر ہو جائے گا کیونکہ یہ بازار میں فروخت ہونے کے ساتھ کسان کی خوراک کا بھی حصہ ہے یہی وہ خوبی ہے جو کپاس میں نہیں ہے۔ عالمی اور مقامی طور پر نافذ سرمایہ دارانہ نظام کے جبر کے تحت کسان بجلی، تیل، کھاد، کیڑے مار ادویات، مالیہ کے ساتھ ساتھ گھی، شکر اور دیگر گھریلو ضروریات کے علاوہ جاگیرداروں کے دباؤ کے تحت ایسی فصلیں مجبوراً اگاتے ہیں، جنہیں بازار میں فروخت کرکے پیسہ حاصل کیا جاسکے۔ اس لیے آج کسان اپنی گھریلو ضروریات کیلئے ایک ساتھ گندم یا چاول اور اسکے ساتھ سبزیاں اور جانور پالنے سے معذور ہوتا جا رہا ہے لیکن گندم اور چاول کی کاشت سے کم از کم یہ ممکن ہوتا ہے کہ کسان اس میں سے کچھ خود بھی صرف کرلے۔ چاول کی جگہ کپاس کی کاشت ملکی زرمبادلے میں اضافے کا سبب تو بن سکتی ہے لیکن کسانوں کے تحفظ خوراک کے مسئلے کو متاثر کرے گی۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ملک کو زراعت کی برآمد سے حاصل ہونے والا زرمبادلہ عوامی مفاد اور بہبود پر خرچ ہونے کے بجائے اس رقم کا بیشتر حصہ آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک کو قرضوں کی واپسی اور فوجی اسلحہ پر خرچ کیا جاتا ہے باقی بچ جانے والی رقم بیوروکریسی، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی عیاشیوں پر خرچ ہوتی ہے۔

چاول کی کاشت پر پابندی اور تحفظ خوراک

پاکستان میں جاری خشک سالی کے باعث چاول کے زیر کاشت رقبہ میں اس سال ۱۱ فیصد کمی ہوگی۔ اس کمی سے چاول کی دو اقسام اری ۹ اور اری ۱۱ کی کاشت متاثر ہوگی جبکہ باسمتی چاول کی پیداوار پر اثر نہیں پڑے گا۔ ایک سرکاری افسر نے کہا کہ ''ہم ادنی قسم کے چاول کی کاشت کی حوصلہ شکنی کر رہے ہیں جبکہ باسمتی جیسی اعلیٰ قسم کے چاول کی پیداوار کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں''۔ (دی نیوز، کراچی، ۱۲، اپریل ۲۰۰۲)

اس خبر سے حکومتی پالیسیوں اور منصوبہ بندی کے رخ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے یعنی اول تو سندھ کے کئی اضلاع میں چاول کی کاشت پر پابندی لگادی گئی ہے اور جہاں چاول اگانے کی اجازت دی گئی ہے وہاں عوام کی اکثریت کا خوراک کے طور پر استعمال ہونے والی اقسام کی حوصلہ شکنی کی جارہی ہے۔ باسمتی جیسے اعلیٰ اقسام کے چاول اگانے کی حوصلہ افزائی اس لیے کی جارہی ہے کہ اس کی برآمد سے حکومت کو زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے جو ملک کے حکمران طبقہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اس طرح ادنیٰ اقسام کی چاول کے نہ اگانے سے کسان اور غریب عوام کے تحفظ خوراک کا مسئلہ خطرناک حد تک بڑھ جائے گا۔

کارپوریٹ طریقہ زراعت

چاروں صوبوں سے تعلق رکھنے والے ریٹائرڈ اعلیٰ افسران اور کاشتکاروں کے ایک گروپ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ کارپوریٹ طریقہ زراعت کی طرف قدم بڑھائے گا تاکہ حکومت کے ان کوششوں کا ساتھ دیا جاسکے، جس کے تحت وہ مختلف فصلوں کی فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ کیلئے کررہی ہے۔

اجلاس کے کنوینئر شوکت خان، جو خود بھی زرعی خدمات کے شعبے سے وابستہ رہے ہیں، نے کہا کہ اجلاس بلانے کا مقصد کارپوریٹ طریقہ زراعت کے عمل کو تیز کرنے پر غور کرنا ہے۔

اجلاس میں شریک ایک شخص مسٹر بھٹو نے ابتدائی تجربہ کیلئے سندھ میں واقع اپنی ۱۲سو ایکڑ زمین پیش کی جبکہ دیگر مقررین نے کہا کہ بہترین نتائج کے حصول کیلئے حکومت کو اپنی زمین پیش کرنی چاہیے۔ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ ابتدائی اقدام کے طور پر گفت وشنید کا آغاز صوبہ سرحد کی حکومت سے کیا جائے گا۔ جس میں ان سے دس کھیتوں (فارم) کی زمین پٹے پر اشتہار کے ذریعے دینے کو کہا جائے، بعدازاں صوبہ پنجاب، سندھ اور بلوچستان کی صوبائی حکومتوں سے دوسرے مرحلے میں اسی منصوبہ کے تحت گفت وشنید کی جائے۔

اجلاس کے شرکاء نے فیصلہ کیا کہ کاروبار کو سرکاری اور نجی شعبہ کی شراکت داری کی بنیاد پر چلایا جائے اور اس امر پر رضامندی کا اظہار کیا کہ اس غرض سے پاک ایگرو سروسز کمپنی لمیٹڈ کے نام سے ایک کمپنی بنائی جائے۔ ایک مقرر نے تجویز پیش کی کہ ایک این جی او بنائی جائے جس میں یو ایس ایڈ، عالمی بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک اور دوسرے ترقیاتی بینکوں سے مدد لی جائے۔ اجلاس میں کئی اداروں اور بینکوں سے وابستہ افراد شریک ہوئے۔ (ڈان، کراچی، ۶، فروری ۲۰۰۲)

فوجی حکومت کے برسراقتدار آنے کے بعد پاکستان میں کارپوریٹ طریقہ زراعت کی باتیں زوروشور سے ہونے لگی ہیں۔ کسانوں کی کسی بھی طرح کی امداد سے قطع نظر بڑے بڑے سرمایہ دار کمپنیوں کی طرف حکومتی جھکاؤ کی وجہ سے غریب کسان بے آسرا ہو رہے ہیں۔

حکومت سمیت عالمی مالیاتی ادارے اور ڈبلیو ٹی او کا کارپوریٹ طریقہ زراعت پر زور کئی سالوں سے عیاں ہے۔ اس طریقہ زراعت میں جدید ترین طریقوں سے زراعت کی جائیگی لیکن جو چیز قابل غور ہے وہ عام کسانوں کی زمینوں سے بے دخلی اور اس کی بڑی بڑی مقامی اور بین الاقوامی کمپنیوں کے ہاتھوں میں منتقلی ہے۔ اس عمل

سے مقامی کسان اور ماحول کو بے انتہا نقصان پہنچے گا جس کے سماج پر منفی اثرات مرتب ہوں گے جبکہ فائدہ بڑی بڑی کمپنیوں کو حاصل ہوگا۔

زرعی انشورنس

مالیاتی شعبہ سے تعلق رکھنے والے ادارے پاکستان زرعی ترقیاتی بینک دیگر تجارتی بینک اور ادارے اور لیزنگ کمپنیاں ایک موثر طریقہ کار پر کام کر رہے ہیں جس کے تحت زرعی شعبہ کو انشورنس کے دائرہ کار میں لایا جائے گا۔ اس سلسلے میں عنقریب ایک کانفرنس کا انعقاد کیا جائے گا۔ انشورنس کی سہولت، اگائی جانے والی فصلوں اور کھیتی باڑی میں استعمال ہونے والے آلات کے لیے اور مقروض کسانوں کو حاصل ہوگی۔ (دی نیوز، کراچی، ۱۲، اپریل ۲۰۰۲)

زرعی شعبہ میں انشورنس متعارف کرانے کا مقصد زراعت کو پوری طرح سرمایہ دارانہ بنانے کے عمل کو تیز تر کرنا ہے۔ زرعی شعبہ میں انشورنس کو متعارف کرنے کے لیے ایک ایسے وقت کو چنا گیا ہے جب خود زرعی معیشت بحران کا شکار ہے۔ اس سے بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ بظاہر یہ گھاٹے کا سودا نظر آتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ دراصل حکومت کے ان خطرناک اقدامات کی نشاندہی کرتا ہے جس کے تحت عنقریب زراعت کو مکمل طور پر بڑی بڑی بین الاقوامی زرعی کمپنیوں کے حوالے کر دیا جائے گا، ورنہ غریب کسان کے پاس روٹی کھانے کو نہیں، وہ انشورنش کی فیس کہاں سے ادا کرے گا۔

پٹسن کی صنعت کو بندش اور گندم کو آلودگی کا سامنا ہے:

پٹسن، ٹیکسٹائل اور چینی کی صنعت کے بعد سب سے بڑی منظم صنعت ہے لیکن اس وقت ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن اور حکومت پنجاب کے اس فیصلے سے کہ جس کے تحت گندم کے لیے سوتلی کی بوری استعمال کرنے کے بجائے پولی پروپائی لین (پلاسٹک) کے تھیلے استعمال کرنے کے فیصلے کی وجہ سے بند ہونے کے قریب ہے۔ حکومت ڈبلیوٹی او کے تحت پٹسن کے مصنوعات پر درآمدی ٹیکس ۲۵ فیصد سے کم کر کے ۱۰ فیصد کرنے پر غور کر رہی ہے۔ پٹسن کی صنعت سے ۲۰ ہزار افراد منسلک ہیں اور اس سے سرکاری خزانے میں ایک ارب روپے سے زیادہ جمع ہوتا ہے۔

محکمہ خوراک نے گندم کے لیے پولی پروپائی لین کے ۱۶ ہزار گھاٹیں خریدی ہیں۔ پولی پروپائی لین کے تھیلے گندم کے لیے موزوں نہیں ہیں کیونکہ یہ نہ صرف صحت کے لیے نقصاندہ ہیں بلکہ زیادہ عرصہ کے لیے رکھے جانے پر پھٹ جاتے ہیں۔ اس سے نہ صرف سرکاری خزانہ کو نقصان پہنچے گا بلکہ گندم بھی آلودہ ہو جائے گا۔

(ڈان، کراچی، ۱۷، اپریل ۲۰۰۲)

حکومت کے فیصلوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے فیصلوں کے نفاذ میں اس قدر مخلص ہے کہ اسے نہ صرف سرکاری خزانہ سے کروڑوں روپے کے ضائع ہونے کا کوئی غم ہے بلکہ وہ ہزاروں مزدوروں کو بے روزگار کرنے اور عوام کو آلودہ گندم فراہم کر کے ان کی زندگیوں سے کھیلنے پر بھی پوری طرح آمادہ ہے۔

کھاد بنانے کے جعلی کارخانے

کرک اور لکی مروت میں چلنے والے چار بڑے کارخانے غیر قانونی طور پر جعلی کھاد تیار کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہزاروں ایکٹر زرخیز زمین بنجر ہوگئی ہے۔ چاروں کارخانوں میں ایسی جعلی ڈی اے پی تیار کی جاتی ہے جو کہ عام طور پر امریکہ اور ترکی سے درآمد کی جاتی ہے۔ جعلی کھاد پر ۴۰ روپے فی بوری اخراجات آتے ہیں جبکہ کسانوں کو یہ ۲۲۰ روپے فی بوری (۴۰ کیلوگرام) فروخت کی جارہی ہے۔ درآمد شدہ ڈی اے پی کی بازاری قیمت ۷۸۰ روپے ہے۔ روزنامہ ڈان کے تحقیقات میں انکشاف کیا گیا ہے کہ تین کارخانوں کی سالانہ پیداوار ۹۰ ہزار بوری ہے۔ کارخانے پچھلے دوسال سے چل رہے ہیں اگرچہ پولیس نے ایک مرتبہ چھاپہ مار کر جعلی ڈی اے پی کو قبضے میں لے لیا تھا لیکن کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ جعلی کھاد بنانے کا سلسلہ برقرار رہا۔ محکمہ زراعت نے کاروبار کو غیر قانونی قرار دیا اور کہا کہ اس نے مقامی پولیس کو اطلاع بھی دی مگر اب تک کوئی کاروائی نہیں ہوئی۔ اخباری اطلاع کے مطابق کاروبار کے مالک کو اس سے چار سال قبل بھی ایک ایسے ہی معاملے میں پوچھ گچھ کا سامنا کرنا پڑا تھا، جس کے بعد اس نے جعلی کھاد بنانے کے کاروبار کو پنجاب سے سرحد منتقل کیا۔

(ڈان، کراچی، ۱۷، مارچ ۲۰۰۲)

ہر سال جعلی کیڑے مار ادویات اور کھاد کے استعمال کی وجہ سے نہ صرف کسان کے مالی بوجھ میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ فصلوں کی تباہی، زمین کی زرخیزی متاثر ہونے کے علاوہ کسان کی صحت اور ماحول کو بھی نقصان پہنچا تا ہے۔

انڈونیشیاء میں کسانوں کی زمینوں سے بے دخلی:

نومبر ۲۰۰۱ میں انڈونیشیا کے صوبہ بانٹین کے ایک گاؤں میں مقامی پولیس نے ۷۶ گھر جلا ڈالے فصلوں کو تباہ اور ۴۹ کسانوں کو گرفتار کیا۔ کسانوں کی زمین پر ریاستی جنگلات کی کمپنی نے دعویٰ کیا ہے۔ یہ کمپنی گزشتہ دو سالوں سے کسانوں کو زمینوں سے بے دخل کر رہی ہے۔

انڈونیشیا کے دیہی علاقوں میں زیادہ تر کسان اپنی روزمرہ کی خوراک پیدا کرنے کی خاطر کھیتی باڑی سے منسلک ہیں جہاں زمین خوراک کی ضروریات پورے کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، لیکن اب سرکار اس حق کو چھیننے کی کوشش کر رہی ہے۔ مقامی حکومت، انڈونیشیا کی فوج کے بل بوتے پر مقامی لوگوں کی خواہش کے برعکس بزور طاقت اپنے منصوبوں کا نفاذ کر رہی ہے۔ سرکاری کمپنی نے جس زمین پر دعویٰ کیا ہے وہ دستاویزات میں کسانوں کی ملکیت ہے۔ (فائن ویا کیم پیسینا)

انڈیا کی حکومت بیج تیار کرنے والی کمپنیوں کے دباؤ کے آگے نہ ٹھہر سکی:

انڈیا کی حکومت نے کپاس کی جینیاتی طور پر تبدیل شدہ بیج (بی ٹی کاٹن) کو متعارف کرانے کی اجازت دے دی ہے۔ بی ٹی کاٹن دنیا کی بیج تیار کرنے والی سب سے بڑی کمپنی مونسانٹو کی تیار کردہ ہے۔ بیج کے استعمال پر علمی حلقوں اور کسان گروپوں کو شدید اعتراض ہے کیونکہ اس سے لاکھوں کسان روزی و روزگار سے ہاتھ دھولیں گے۔ جینیاتی کپاس کے بعد خوراک کی دیگر اشیاء مثلاً آلو، رائی اور دیگر فصلوں کے ساتھ مچھلیوں کے لیے بھی راہ ہموار ہوگئی ہے۔

مونسانٹو کئی سالوں سے حکومت پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ جی ایم بیجوں اور فصلوں کے استعمال کی اجازت دی جائے۔ کمپنی نے اس امید پر کہ حکومت کبھی نہ کبھی تو اس کی اجازت دے دے گی، انڈیا کی بیج تیار کرنے والی بڑی کمپنیوں کو خریدنے پر لاکھوں پاؤنڈز پہلے ہی خرچ کر چکی ہے۔

جی ایم بیج کے خلاف سرگرم لوگوں کا خیال ہے کہ اس فیصلے سے مختلف بیجوں پر بین الاقوامی کمپنیوں کے قبضے میں مدد ملے گی اور اس سے ایک نئے معاشی نوآبادیاتی نظام کا آغاز ہوگا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ برطانوی حکومت ایک جینیاتی اسکیم کے امداد کے لیے بھارتی حکومت کو ۶۵ ملین پاؤنڈز کی رقم دے رہی ہے۔ زرعی ترقی کے اس نام نہاد منصوبہ کا نام "ویژن ۲۰۲۰" رکھا گیا ہے۔ اس منصوبہ کے تحت اندھرا پردیش کی حکومت کے زیرنگرانی بڑے پیمانے کی صنعتی طریقہ پیداوار (بالفاظ دیگر کارپوریٹ طریقہ) متعارف کروایا جائیگا، جس میں جینیاتی طور پر تبدیل شدہ بیج متعارف کروانا بھی شامل ہے۔ اس منصوبہ سے علاقہ کی ۳۰ فیصد آبادی یعنی ۲۰ ملین (۲ کروڑ) کسان دربدر ہوجائیں گے۔ یہ یاد رہے کہ ۱۹۹۹ میں کسانوں کے ایک گروپ نے غم و غصہ کے اظہار کے طور پر اندھرا پردیش میں واقع جینیاتی کپاس کے تجرباتی کھیتوں کو نذر آتش کیا تھا۔

جان ویڈال، ڈان، ۲۸، مارچ ۲۰۰۲ اور ڈائیورس ویمن فار ڈائیورسٹی لسٹ سروو، ۱۹، مارچ ۲۰۰۲ (beb@igc.org)

جینیاتی طور پر تبدیل شدہ اجسام اور معاہدے برائے تحفظ ذہنی ملکیت کے خلاف جدوجہد:

جینیاتی انجیئرنگ اور معاہدے برائے تحفظ ذہنی ملکیت (ٹرپس) کے خلاف سرگرمیوں میں تیزی پیدا ہوگئی ہے۔ اس سال اپریل میں بائیوڈرائیورسٹی کانفرنس (ہیگ، اپریل) خوراک کی عالمی کانفرنس (روم، جون) اور عالمی کانفرنس برائے پائیدار ترقی (جوہانسبرگ، اگست) کے موقع پر ایسے مطالبات پیش کیے جائیں گے جن میں جینیاتی طور پر تبدیل شدہ اجسام، پودوں اور جانوروں کو دائرہ ملکیت میں لانے پر پابندی اور کسانوں کے لیے زمین کا حق اور مرد اور خواتین کے لیے قدرتی وسائل تک رسائی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ایک تنظیم ویا کیمپسنا نے خاص طور پر تیاری کی ہے۔ اس تنظیم کے تحت اپریل میں ہونے والے بائیوڈائی ورسٹی کانفرنس کے موقع پر کانفرنس کے اندر اور باہر، دونوں سطح پر مطالبات اور احتجاج کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ اس موقع کو تنظیم نے کسانوں کی جدوجہد کا دن قرار دیا ہے۔

ڈائیورس ویمن فار ڈائیورسٹی لسٹ سروو، ۱۰، اپریل ۲۰۰۲ (beb@igc.org)

آزاد تجارت کا صلہ قحط اور معاشی و سماجی بربادی ہے

سینٹرل امریکہ قحط کے گرفت میں ہے اور اگر امریکی صدر بش سے جو کہ ایل سلواڈور کا دورے کرنے والے ہیں، اس کا حل پوچھ لیا جائے تو وہ آزاد تجارت تجویز کریں گے۔ لیکن آزاد تجارت کے نتیجے میں گوئٹے مالا، ایل سلواڈور، ہنڈراس اور نکاراگوا کے دیہی علاقوں میں حالات انتہائی خراب ہیں۔ منڈی پر حکومتی کنٹرول کے خاتمے کے بعد سینٹرل امریکہ کے ۷۰۰,۰۰۰ افراد کو غذا کی کمی اور بھوک کا سامنا ہے جبکہ دس لاکھ کے

قریب افراد کو غذا کی کمی سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق کافی اور مکئی اگانے والے کسانوں سے ہے۔ اسی طرح کولمبیا میں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے تجویز کردہ معاشی اصلاحات کے نتیجے میں بیروزگاری اپنی انتہائی حدود کو چھو رہی ہے کیونکہ آئی ایم ایف کے دباؤ کے تحت حکومت سرکاری کارخانے اور خدمات کے شعبے کی نجکاری سود کی شرح میں اضافہ، سرکاری فلاح و بہبود میں کمی کے علاوہ عوام پر بھاری شرح سے ٹیکس عائد کرنے کے علاوہ اپنی معیشت کے دروازے عالمی سطح پر مقابلے کے نام پر کھول رہی ہے۔

ڈائیورس ویمن فار ڈائیورسٹی لسٹ سروو، ۱۰، اپریل ۲۰۰۲ (beb@igc.org)

آزاد تجارت اور غریب کسان

مکئی کی کاشت سب سے پہلے میکسیکو میں پانچ ہزار سال قبل شروع کی گئی اس لیے آج یہ میکسیکو کی تہذیب کا مرکز ہے۔ مکئی ہر شہری کے خوراک کا لازمی جز ہے لیکن غریب آبادی خوراک کے طور پر صرف مکئی استعمال کرتی ہے۔ میکسیکو میں ۳ ملین کسان مکئی اگاتے ہیں جو تقریباً ۱۵ ملین افراد پر مشتمل خاندانوں کے خوراک کا باعث بنتے ہیں۔

ماہرین کے مطابق اب آزاد تجارت کے طفیل یہ خوراک بھی غریب آبادی سے چھین لی جائے گی۔ زراعت کی تجارت سے وابستہ طاقتور امریکی کمپنیاں خطے کی بنیاد پر بننے والی آزاد تجارت کی تنظیم (نافٹا) کے تحت کیے گئے معاہدوں کی بدولت کسانوں سے ان کی زندگی کا واحد وسیلہ بھی چھین رہی ہے۔ کسانوں کی ایک بڑی تعداد کافی یا گنا اگاتے ہیں یا پھر روزگار کی تلاش میں شہروں کا رخ کر رہے ہیں کیونکہ آزاد تجارت کی وجہ سے امریکہ سے بڑی تعداد میں مکئی میکسیکو لائی جاتی ہے۔ اس وقت درآمد شدہ مکئی کی مقدار ۳۳ فیصد ہوگئی ہے۔ سستی مکئی کی امریکہ سے درآمد کی بڑی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں مکئی کی کاشت کرنے والوں کو حکومت کروڑوں ڈالرز سالانہ امداد دیتی ہے اس طرح بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیاں اس کی تجارت کر کے منافع کماتی ہیں۔

آئی اے ٹی پی لسٹ سروو، ۲۶، فروری ۲۰۰۲ (ag-impact@iatp.org)

ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے سربراہ کا اعتراف

ڈبلیو ٹی او کے سربراہ مائیک مور اپنے ایک حالیہ مضمون میں خود ہی تسلیم کرتا ہے کہ کم از کم ۵۰ ممالک ایسے ہیں جو اپنی برآمدات کے لیے زیادہ تر زراعت پر انحصار کرتی ہیں، لیکن دنیا کے ترقی یافتہ ممالک او ای سی ڈی (او ای سی ڈی دنیا کے ۳۰ ترقی یافتہ ممالک اور یورپی یونین پر مشتمل ہے) کی وجہ سے زرعی برآمدات میں کمی واقع ہوئی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک نے عالمی منڈی سے ان ترقی پذیر ممالک کو بھی نکال باہر کر دیا ہے جو پہلے کافی حد تک مقابلہ پر ہوتے تھے۔ اس کی وجہ ان کے بقول ترقی یافتہ ممالک میں اربوں ڈالرز روزانہ کے حساب سے دی جانے والی امدادی رقوم ہیں۔

(مائیک مور، نیا بین الاقوامی ایجنڈا، ڈان، ۱۸، اپریل ۲۰۰۲)

بڑے ڈیموں سے متعلق ورلڈ بینک کی پالیسیاں تنقید کی زد میں

ورلڈ بینک کی پالیسیوں پر مختلف سطحوں پر تنقید کی جا رہی ہے۔ حال ہی میں ورلڈ بینک کا پانی کے بڑے بڑے ڈیموں کے بارے میں اس کی پالیسیاں ایک بار پھر شدید تنقید کی زد میں آئی ہیں۔ بینک پر ہر طرف سے تنقید ہو رہی ہے کہ وہ دی ورلڈ کمیشن آن ڈیمز (ڈبلیو سی ڈی) کے سفارشات کے نفاذ میں ناکام رہی ہے جو دی ورلڈ کمیشن آن ڈیمز نے پانی اور توانائی کے ضمن میں پیش کیے ہیں۔

کئی تحقیقی رسائل میں بینک کے یوگینڈا میں بوجگالی ڈیم کے بارے میں قابل اعتراض دوغلے پن کی مذمت کی گئی ہے۔ عالمی بینک اگرچہ یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ بوجگالی ڈیم کا پروجیکٹ ''ماحولیاتی اور سماجی نقطہ نظر سے ناقابل قبول ہے'' پھر بھی اس نے فیصلہ کیا ہے کہ اس منصوبہ کو قبول کیا جائے۔ ایک تجارتی جریدے دی انجیئرنگ نیوز ریکارڈ، بینک کے اس بیان کو اس بچے کی بیان سے مشابہ قرار دیتا ہے جو کہتا ہے کہ اس کا فلاں عمل اس لیے درست ہے کیونکہ دوسرے بھی ایسا کرتے ہیں۔ اسی طرح دی انٹرنیشنل ریورز نیٹ ورک کے ڈائریکٹر نے کہا کہ بینک نے تباہی پر مبنی اور لوگوں پر بوجھ بنے ہوئے اپنے بڑے بڑے منصوبوں کی امداد کی تاریخ سے بہت کم سیکھا ہے۔ (http://www.brettonwoodsproject.org)

غربت اور منافع میں اضافہ

آزاد تجارت کی وجہ سے ایک طرف پاکستان جیسے زرعی ممالک کی آمدنی میں کمی اور عوام کی غربت میں اضافہ ہو رہا ہے تو دوسری طرف زراعت سے وابستہ کمپنیوں کے منافع میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے مثلاً اناج کی تجارت کرنے والی دنیا کی سب سے بڑی زرعی کمپنی، کارگل کی تیسری سہ ماہی کی آمدنی میں ۶۳ فیصد اضافہ ہوا ہے۔

کارگل پریس ریلز، ۱۶، اپریل ۲۰۰۲، آئی اے ٹی پی لسٹ سروو (ag-impact@iatp.org)

قارئین سے

چیلنج کے بارے میں آپ کی تنقید، آراء اور تجاویز کو خوش آمدید کہا جاتا ہے